خاندانِ لوہارو کے شعراء

حمید سلطان احمد

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

خاندانِ لوہارُو کے شعراء

خاندانِ لوہارُو کے شعراء

حمیدہ سلطان احمد

غالب انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سنِ اشاعت: جون ۱۹۸۱ء
باراوّل

○

تعداد : ایک ہزار
قیمت : ۳۰ روپے

○

ناشر : غالب انسٹی ٹیوٹ
اہتمام : شاہد ماہلی

○

کتابت : رحمت علی خاں رام پوری
طباعت:

ملنے کا پتہ
غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اس کتاب کی طباعت
اور پروسس "پرنٹو اینڈ پروسس"
۱۴۲۔ مادی پور، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام ہوئی۔

لاہوتی فائن آرٹ پریس، ۱۷۱۱۔ سوئیوالان، دہلی

ترتیب

خاندانِ لوہارو

نواب قاسم[1] جان کی محترم شخصیت پہلے ہندوستان میں خاندانِ لوہارو کی بنیاد بنی۔ نواب قاسم جان کے جدِ اعلیٰ کا نام خواجہ محمد امین تھا۔ خواجہ صاحب کا وطن یارقند تھا۔ وہ امیر معصوم (شاہ مراد بیگ خلف امیر دانیال کے دادا کے معلم تھے۔ یہ امیر دانیال "بیگی جان" اور "امیر بخارا" کے نام سے زیادہ معروف تھے۔ یارقند مشرقی ترکستان میں اس نام کے دریا کے کنارے واقع ہے۔ خواجہ امین نے اپنے وطن یارقند میں وفات پائی۔ ان کے فرزند خواجہ رحمت اللہ تورہ تھے۔ ان کا انتقال بخارا میں ہوا۔ تورہ دراصل ایک خاندانی اعزازی لقب ہے جیسے خواجہ، نقیب اور بیگ۔ ان القاب کے حامل اشخاص اکثر بادشاہ کے مشیر اور درباری ہوا کرتے تھے۔ خواجہ رحمت اللہ تورہ سے اولادِ نرینہ میں دو لڑکے سعید اللہ خاں اور عبدالرحمٰن بیگ خاں تھے۔ ان دونوں کا انتقال بھی بخارا میں ہوا۔ عبدالرحمٰن بیگ خاں کی شادی سمرقند میں مرزا نصیر الدین خلف ضیا جان بیگ مشہور بہ خواجہ سفر کی لڑکی رابعہ ماہ سے ہوئی۔ خواجہ سفر کا شمار سمرقند کے مشاہیر شرفا میں سے تھا۔ وہ ملک التجار تھے۔ عبدالرحمٰن بیگ خاں بلخ میں منتظم دیہات اور مہتمم دار الضرب شاہی تھے۔ رابعہ ماہ کے بطن سے ان کے ہاں تین لڑکے قاسم جان، عالم جان، عارف جان اور ایک لڑکی عالمہ ماہ تولد

---

[1] نواب قاسم جان کی ولادت تقریباً ۱۷۱۱ء وفات ۱۷۹۷ء ہے۔

ہوئے۔عالمہ کی شادی میر عبدالقاسم سید ہزارہ وزیر میر ہزارہ (شاہ بخارا) سے ہوئی۔قاسم جان کی شادی خان ہزارہ کی اکلوتی بیٹی عزیز النسا سے ہوئی۔

میر نظر ہزارہ ایک فوجی سپہ سالار تھا جو معین الملک کی گورنری کے زمانے میں کسی بنا پر قتل کر دیا گیا۔

عارف جان کی شادی مرزا محمد بیگ قلیچ گورنر اٹک کی صاحبزادی سے ہوئی۔لوہارو والے دراصل تورانی النسل تھے۔اس لیے اپنے خاندان ہی میں رشتے ناطے کرتے تھے اور نام کے ساتھ مرزا لگانا ضروری سمجھتے تھے۔مرزا اصل میں امیرزا تھا۔میرزا بمعنی امیرزادہ۔

نواب علاءالدین خاں علائی نے اپنی قلمی بیاض میں لکھا "واضح ہو کہ ہماری دو قومیں نسبتی، ایک ملکی اور دوسری قومی نسبت جو تاتار سے ہے وہ برلاسی ہے۔نظر برآں ہم چغتائی برلاس قوم ہیں اور تلوار ہمارا اصلی تمغہ، ہماری قومی ابتدا استغنا بزور شمشیر تھی۔چاند کی صورت گویا فلک کی نسبت قمر سے ہے چنانچہ کاغذات مراسلات ریاست لوہارو فلیگ کا یہی تمغہ مونوگرام یا طغرا ہے لیکن نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں اور ان کے فرزند اصغر مرزا سعیدالدین احمد خاں طالب اپنے آپ کو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی اولاد میں ثابت کرتے ہیں۔اور اس کو دلائل سے منوانے پر مصر ہیں۔طالب نے کہا ہے ؎

المختصر کہ خادمِ شاہِ نجف ہیں ہم
مشکل کشا ہیں جن کے سلف وہ خلف ہیں ہم

نواب ضیاءالدین احمد خاں نے حکومت پنجاب کو جو شجرہ اپنے خاندان کا مرتب کر کے دیا، اس میں عارف جان کو خواجہ احمد یسیوی کی نسل سے ظاہر کیا ہے۔لفظ خواجہ ہمیشہ ان لوگوں کے ناموں کے ساتھ ہوتا ہے، جو اہلِ سادات کے ساتھ کسی اور ذات یعنی مغل یا پٹھان کے ساتھ مل کر بنے۔اس لیے خواجہ محمد امین علوی ہو سکتے ہیں اور مغل برلاس کا میل بھی ان میں ہوگا۔نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں جیسے ماہر تاریخ داں سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنا نسب ہی ٹھیک نہ بتا سکیں۔اغلباً لوہارو خاندان میں علوی اور مغل دونوں ملے جلے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ احمد یسیوی جو خواجہ عبدالرحمٰن کے اجداد میں سے تھے علوی تھے لیکن

خواجہ عبدالرحمٰن کو شاہی منصب دار ہونے کے باعث تذکرہ نگاروں نے خان اور بیگ لکھا ہے۔ یہ ان کے عالی خاندان ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن سر ہنری ایلیٹ نے اپنی تاریخ الانساب میں لکھا ہے "نواب احمد بخش خاں مغل تھے" احمد بخش خاں نے پہلے اپنے نام کے ساتھ مرزا کا لقب لکھنا شروع کیا۔ ۱۸۲۳ء میں جنرل ڈیوڈ اختر لونی نے نواب شمس الدین احمد خاں اور ان کے بھائی ابراہیم علی خاں سے جس قدر خط و کتابت کی ان حضرات کو ہمیشہ مرزا کے لقب سے یاد کیا۔ ۱۸۳۲ء میں مرزا شمس الدین نے اپنی ریاست کے لیے جو مہر بنوائی اس پر بھی "ترک" کندہ تھا۔

نیر رخشاں اور علائی کے خاندان کے بیان میں تضاد کی اصل وجہ ذاتی رنجش ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اور نواب امین الدین احمد خاں دونوں بھائیوں میں کسی خانگی وجہ سے رنجش ہو گئی تھی۔ اس لیے باوجود اس کے کہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی اپنے چھوٹے چچا کا بہت ادب و احترام کرتے تھے لیکن پسِ پشت ان کو نیچا دکھانے مواقع بھی ڈھونڈھتے رہتے۔ یہ خاندان کے متعلق مغالطہ بھی انھوں نے محض چچا سے مخالفت کی بنا پر کیا، ورنہ صاف ظاہر ہے کہ خواجہ عبدالرحمٰن جو قاسم جان، عارف جان اور عالم جان کے والد علوی تھے۔

خاندانِ لوہارو کو خدا نے صاحبِ سیف و قلم بنایا۔ قاسم جان بیگ نے شاہ عالم کے عہد میں اپنی غیر معمولی بہادری کی وجہ سے نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب مغل سلطنت سے پایا اور ان کے بھتیجے احمد بخش خاں خلف عارف جان نے لارڈ لیک کے ساتھ مہاراجہ الور کی جانب سے مہمات میں شرکت کی اور فتح پانے کے انگریز حکومت سے جاگیر میں فیروز پور جھرکا، پونا ہانہ بچھور، نگینہ پایا۔ نواب فخر الدولہ رستم جنگ دلاور ملک خطاب اُن کو ملا۔ مہاراجہ الور نے پرگنہ لوہارو اپنی جانب سے دے کر جاگیر میں اور اضافہ کر دیا۔

حمیدہ سلطان احمد

لہ خواجہ احمد یسوی کے متعلق آئین اکبری نسخہ مرتبہ سرسید میں۔ واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ آپ نے ابو یوسف ہمدانی سے کمال حاصل کیا بے شمار کرامات ان کی بیان کی جاتی ہیں۔ ان کے چار خلیفہ تھے۔ منصور عطا، سعید عطا، سلیمان عطا، حکیم عطا۔ ویس ایک آباد حصہ ترکستان کا ہے یہی مقام خواجہ احمد یسوی کا وطن اور جائے ولادت ہے۔ (آئین اکبری جلد دوم، مطبوعہ دار الطبع عثمانیہ حیدر آباد (دکن) صفحہ ۳۲۴-۳۲۵

مرزا اعز الدین احمد خاں اعظم

نواب اعز الدین احمد خاں اعظم مرزا ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، نواب اعظم بہت ذہین، حسّاس اور مدبّر انسان تھے، صحت اُن کی اوائلِ عمری سے کمزور رہی، اپنے مکرّم والد نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا کی زندگی میں ہی عنانِ ریاست ہاتھ میں لی، نواب فرخ مرزا کی بے حد داد و دہش اور مشاغلِ طرب کی بدولت ریاست بہت مقروض ہو گئی تھی۔ اعظم مرزا نے اپنے حسنِ انتظام کی بدولت قرض کا بار ریاست پر سے اتار دیا، شعر و ادب اِن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ عالمِ طفولیت میں ہی شاعرانہ فضا ملی تھی، لڑکپن سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے، لیکن باقاعدہ شاعری اپنی خورد وش چہیتی جواں مرگ رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد شروع کی [۱]، اور دو سال ہی میں دیوان

---

[۱] اعظم مرزا کی پہلی شادی اپنے عم مرزا بشیر الدین احمد خاں کی دختر نیک اختر ذکیہ سلطان سے ہوئی تھی۔ پری جمال ذکیہ ۲۹ سال کی عمر میں عین عالمِ شباب میں عاشقِ زار شوہر کو داغِ جدائی دے گئیں۔ اعظم مرزا کا دوسرا نکاح ذکیہ سلطان کی حقیقی بھتیجی اور ان کے بڑے بھائی معز الدین سام مرزا کی صاحبزادی خدیجہ سلطان سے ہوا۔ ذکیہ سلطان نے پانچ خورد سال بچے چھوڑے انہی کے بڑے صاحبزادے نواب لوہارو ہیں۔

مکمل کرلیا، پھر مثنوی نور جہاں جہانگیر لکھی، یہ مثنوی اپنی زبان کی سلاست اور انداز بیان کی دلرُبائی کی بدولت ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہے افسوس یہ مُدبّر نواب خوش فکر شاعر، دردمند دل رکھنے والا انسان آنتوں کی دق میں مبتلا ہو کر عمر کی بیالیس منزلیں طے کرنے سے قبل ہی ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۶ء میں دُنیا سے سدھار گیا۔

اعظم مرزا کے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں ثانی شہریار مرزا اب نواب لوہارو ہیں۔

مثنوی گلزار اعظم ایک بڑا تاریخی اور ادبی کارنامہ ہے، جس کو بہت محنت اور تحقیق کے بعد نواب اعظم نے ترتیب دیا۔ اِس مثنوی میں شاہانِ مغلیہ کے محلات کے طور طریقے، بیگمات کی گفتگو، شاہی شادیوں کے رسم و رواج، آپس کا میل جول اور اس دور کے تفریحی مشاغل بڑی خوش اسلوبی سے بیان کئے گئے ہیں۔ پھر زبان ایسی شستہ و رفتہ ہے کہ ہر شعر کی فصاحت بلائیں لیتی ہے، مینا بازار کی سیر دیکھئے کس اچھی طرح قابل مُصنّف نے کرائی ہے:

ہر ماہ محل میں شہ کے اک بار — آتی تھی بہارِ مینا بازار
محلوں کی چمن کی پٹڑیوں پر — دُکانیں لگاتے تھے برابر
اِک رشکِ چمن ہر اک دُکاں پر — قیمت کا گلوں سے لیتی تھی زر
محلوں میں جہاں ہوا ایسا جلسہ — منظر وہاں ہو گا کیسا اچھا
تھا حکم کہ ہو لباس رنگین — اِس میلے کا گویا یہ تھا آئین

پھر اولوالعزم نواب بڑی خوبی سے شہزادہ سلیم کی تربیت کا ذکر کرتے ہیں، مغل شہزادوں کی تربیت کس ماحول میں ہوا کرتی تھی، ایک فرماں روا سے اس کا بیان سُنیئے اور لُطف لیجئے:

صورت کا تھا شاہزادہ اچھا — بڑھنے لگا ہونہار بچہ
کیا ذکر ہو پرورش کا اِس کی — نعمت جہاں اک زمانے کی تھی
اُستاد تھے ایک چھوڑ صد ہا — شہزادے نے فن ہر ایک سیکھا

تھی فارسی تو خود اُس کے گھر کی ترکی کی طرح ایک ادنیٰ لونڈی
ہر قسم کا فن سپہ گری کا نسلوں سے وہاں خمیر میں تھا
دن وہ نہ تھے جبکہ شاہزادے محلوں کے ہوتے رہنے والے
دن اور تھے اور تھا زمانہ تھی زندگی جب سپاہیانہ
ورنہ کہاں ہوتی ملک داری ہاتھوں سے عدو کے ہوتی خواری
ہر ایک تھا اسے یہی سُناتا تھے آپ کے باپ جیسے دادا
با علم و ہنر شجاع و عاقل فیاض و سخی و رحیم و عادل
کچھ اک وہی نہیں شاہ بابر شیروں سے بھی بڑھ کے تھے دلاور
دو تین کیا سات پیڑھیوں تک ہر ایک کا یہی رہا ہے مَسلک
بچہ جو سُنے گا سب کی ایک بات دل میں وہی رکھے گا خیالات
صحبت ہے بڑی سکھانے والی اُستاد فقط نہیں ہے کافی
جب اچھی تھی صحبت اور استاد اور اِس پہ ذہانت خداداد
کس طرح نہ ہوتا شاہزادہ ہر علم و ہنر میں مرد یکتا
تھا، کھیل لڑانا ہاتھیوں کا گھوڑے پہ شکارِ شیر کرنا
قصے بھی بہادری کے سُننے یہ مشغلے شاہزادے کے تھے
وہ شعر و سخن سے رکھتا تھا ذوق اور نثر نگاری کا بھی تھا شوق
ہے اس کی تزک ثبوت اس کا موتی ہے ہر ایک لفظ جس کا

شہزادہ سلیم کا بچپن اِسی ماحول میں گزرا، اور عالمِ شباب آیا:

شہزادے کی آگئی جوانی یوسف کا ہوا سلیم ثانی
جیسا کہ حسینوں کا ہے دستور صورت پہ بہت تھا اپنی مغرور
تھا اُس کو غرورِ حُسن اتنا مہرالنساء کو کبھی جو دیکھا
ہر چند وہ حُسن میں تھی یکتا اپنے سے نہ بہتر اس کو سمجھا
ہے نشۂ حُسن بھی عجب شے ہوتا ہے یہ نشہ بے پیئے مے

شہزادہ شراب بھی تھا پیتا　　جس سے یہ نشہ ہوا دو بالا
کچھ اُس کو خبر نہ تھی کہ تقدیر　　کرنے کو ہے جلد ایسی تدبیر
مہرالنساء سے اِسے ملاکر　　اِک پردۂ طلسم کا دکھاکر
بے دام کرے گی اس کو بندہ　　اِک رشکِ پری و مہروش کا

شہزادے کے حسن وجمال کا نقشہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ اب مہرالنساء کے دل رُبا حسن کا عکس بھی دیکھئے، شہزادے سلیم کی شادی آمیر راج کی راج کماری سے ٹھہر چکی ہے، شاہی محلوں میں شادی کا جشن ہو رہا ہے۔ مہرالنساء بھی اِس جشن میں ماں کے ساتھ شرکت کے لئے آئی ہے:

محلوں میں چھپا بیاہ کا ڈھول　　مہمانوں کے آئے غول کے غول
مہرالنساء بھی بناؤ کرکے　　ساتھ آئی محل میں اپنی ماں کے
پہنے ہوئی تھی گلابی جوڑا　　اوڑھے ہوئے کاسنی دوپٹہ
سلمے کا تھا اِس لباس پر کام　　جس کام میں نقص کا نہ تھا نام
اک موتیوں کی گلے میں مالا　　اور ماتھے پہ ہیرے کا تھا ٹیکا
ہاتھوں میں بھی کانوں میں بھی موتی　　پازیب جڑاؤ زیب پا تھی
وہ جوڑا، وہ زیور اور وہ صورت　　ہر ایک کو دیکھ کر تھی حیرت
سکتے کا سا تھا محل میں عالم　　بھرتے تھے وہاں اس کا سب دم
آتا تھا یہی خیال سب کو　　کیا خوب ہو اگر یہی دُلہن ہو
کچھ دل میں جو بیٹھے بیٹھے آیا　　اِس نے لیا راستہ چمن کا
محلوں کا چمن عجیب تھا باغ　　اِس گُل سے اِرم وہ بن گیا باغ
تھی سیر کناں وہ رشکِ گلشن　　پورا نہ گیا تھا جس کا بچپن
ڈھلکا ہوا سر سے کچھ دوپٹہ　　اِک حوض میں عکس کو جو دیکھا
خود رہ گئی عکس دیکھ کر دنگ　　وہ بال سیاہ وہ چہرہ گُل رنگ
اور ساتھ میں اس کے جامہ زیبی　　زیور کی جُدا پھبن، نرالی

قسمت نے تماشا کیا دکھایا — شہزادہ بھی اس طرف سے گزرا
آواز سے پاؤں کی وہ چونکی — تسلیم ادب سے اس نے پھر کی
ہاتھوں میں لئے تھا وہ کبوتر — ہاتھ اپنے سلیم نے بڑھا کر
مہرالنساء سے کہا کہ اِن کو — ہاتھوں میں بہ احتیاط پکڑو
ہلنا نہ یہاں سے اک قدم بھی — یہاں دیکھتی رہنا راہ میری
تعمیل ضروری وہ سمجھ کر — ہاتھوں میں لئے رہی کبوتر

لیکن اپنے دل سے باتیں کرنے میں مہرالنساء مصروف ہو کر یہ بھول گئی کہ اِس کے ہاتھ میں کبوتر بھی ہیں۔ سوچنے میں ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو ایک کبوتر چھوٹ گیا اور شہزادے نے واپس آکر کبوتر مانگے تو..........

بھولی تھی وہ بولی عذر کرنا — اور آتا نہ تھا کسی سے ڈرنا
شرمیلی نگاہ اُٹھا کے بولی — کچھ اِس میں نہیں خطا ہے میری
اِک اِن میں سے اُڑ گیا پرندہ — وہ سامنے شاخ پر ہے بیٹھا
کہنے لگا اُڑ گیا وہ کیونکر — مہرالنساء نے وہ ہاتھ اُٹھا کر
جس میں تھا دوسرا کبوتر — اِس کو بھی اُڑا دیا مسکرا کر
اور ساتھ ہی ایک ادا سے بولی — یوں اُڑ گیا وہ جناب عالی
یہ کہنا وہ بھولے پن سے کرنا — غصے سے ذرا نہ اِس کے ڈرنا
شہزادے کے واسطے تھا کافی — فوراً ہی طبیعت اس پہ آئی
اِس ہاتھ سے مُرغ اُڑا واں — شہزادے کا مُرغِ دل اُڑا یاں
وہ جوڑے کے اپنے پاس پہنچا — یہ زلفِ دوتا میں جا کے اُلجھا
وہ قید سے چھوٹا یہ ہوا قید — اور تیرِ نظر کا ہو گیا صید
حیرت کا بنا سلیم پُتلا — دیکھا کیا مُنہ سے کچھ نہ بولا
اس وقت ہوئیں دوچار آنکھیں — کہنے لگیں حالِ دل نگاہیں
کہنے کی نہ منہ سے کچھ تھی طاقت — آتی ہے بھلا کہاں یہ نوبت

جب لگتا ہے دل میں تیرِ مژگاں   اور پھنستا ہے گیسوؤں میں انساں
ہوتا ہے عجیب وقت ایسا   ممکن ہی نہیں بیان اِس کا
بُت بن گئے دونوں بُتِ مقابل   اُلفت کا وہ اُس کی اُس سے سائل
جب دیر ہوئی کوئی نہ بولا   مہرالنساء کو خیال آیا
یہ مرد ہے اور میں ہوں عورت   عورت کا ہے زیور اِس کی عصمت
گر دیکھا کسی نے یہ تماشا   ہو جائے گا جابجا چرچا
رکھتی ہوں شرافت و حیا میں   عصمت کا نہ لوں نام مٹائیں
عصمت النساء ہے ماں کا مری نام   بیٹی کو ہوا اُس کی عشق سے کام
سمجھا کے وہ دل کو یوں حسینہ   واں سے ہوئی الغرض روانہ
جاتے ہوئے پر سلام کر کے   اُس بُت کو وہ اپنے رام کر کے
شہزادے کو یا غلام کر کے   کام اِس کا گئی تمام کر کے

صرف عشق و محبّت کے رموز ہی نہیں اِس مثنوی میں سمجھائے گئے، جہانگیری اور جہاں بانی کے طریقے اور فرمانروائی کے انداز بھی بتائے گئے ہیں۔ اکبرِ اعظم بسترِ مرگ پر اپنے چہیتے بیٹے اور ہندوستان کے ہونے والے بادشاہ کو کس دل نشین انداز میں وصیت کرتا ہے، یہ دیکھیے اور اس دلآویز اندازِ نگارش کی داد دیجیے:

وہ شاہ ہی کیا جو ہو نہ عادل   اور حالتِ ملک سے ہو غافل
انصاف سے کرنا تم حکومت   ہو عیش مگر نہ کرنا غفلت
مذہب کا سوال بھی ہے ٹیڑھا   ہر ایک کو ہے اختیار اپنا
ہر شخص سمجھتا ہے کہ میرا   مذہب ہے جہاں میں سچّا
حاکم کو غرض نہیں ہے اس سے   کیوں دل میں تعصب اپنے رکھے
ہے بلکہ یہ فرض بادشاہ کا   خود چاہے وہ کچھ رکھے عقیدہ
لیکن نہ وہ ذکر یہ نکالے   کمزور ہیں اوروں کے عقیدے
ملّت کی ہر ایک کی گر ہو حرمت   ہوتی ہے جہاں کو شہ کی اُلفت

جس شاہ سے خوش رہے رعایا — آفت سے نہیں ہے اس کو کھٹکا
ہے یہ بھی نصیحت ایک میری — جو اوروں سے نہیں کم ضروری
ہوتا ہے جو شہ کینہ پرور — نقصان اُٹھاتا ہے وہ اکثر
گر ہاتھ میں تانبا میں اُٹھاؤں — اور سونے کو خاک میں ملاؤں
قیمت میں نہ سونا ہوگا کمتر — تانبا نہیں ہوگا اس سے بہتر
اچھوں کو گر بڑھاؤ گے تم — پھر اور بھی اپنا بناؤ گے تم
گر یاد رہی میری وصیت[1] — اِس شاہی کی بگڑے گی نہ حالت
جاری رہے گی یہی ترقی — اور شاد رہے گی روح میری

شہنشاہ جہانگیر نے باپ کی وصیت پر پورا عمل کیا۔ اور اپنی وسیع مملکت کے انتظام، رعایا پروری اور عدل گستری میں کھو کر مہرالنسار کو بھول جانے کی کوشش کی، لیکن حضرت عشق کی سرکار میں خواہ شاہ ہو یا گدا سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوتا ہے۔ دل آخر دماغ پر غالب آیا نوروز کے جشن میں جہانگیر کو مہرالنسار پھر یاد آئی۔

نوروز کا جشن ہو رہا تھا — باہر سے محل میں شاہ آیا
سب بیگمیں شہ کے پاس آئیں — اور گائنیں خوب گیت گائیں
تھی شام قریب شاہ اُٹھا — اور صحنِ چمن میں پھرنے آیا
تھی شاہ کے ساتھ مان بائی — وہ تھیں ملکہ بڑے محل کی
اور ساتھ میں جودہ بائی بھی تھیں — اور بیگمیں ان کے پیچھے آئیں
زیور میں لدی ہوئی ہر اِک تھی — پوشاک جُدا جُدا تھی سب کی
مخمور تھا شاہ اور خنداں — اِس حُسن کدے میں تھا وہ شاداں

---

[1] شہنشاہ اکبر کی زبان سے وصیت کرنے والے حکمراں کا اندازِ حکومت بھی یہی تھا۔ ریاست لوہارو میں دسہرے کا دربار عیدین کے دربار سے زیادہ دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ کیونکہ لوہارو کی آبادی میں اکثریت جاٹوں اور بنیوں کی تھی۔

دل سے تھا بھلا دیا کسی کو — انصاف سے تاکہ سلطنت ہو
ناگاہ اس جگہ وہ پہنچا — مہرالنساء کو جہاں تھا دیکھا
خنداں تھا فسردہ ہو گیا وہ — پھر عشق کا بندہ ہو گیا وہ
بھولا جو کیا تھا عہد دل میں — یاد آ گئیں سب پرانی باتیں

آخر قدرت نے ان دو ہجراں نصیبوں کو یکجا کر دیا۔ جہانگیر اپنی محبوبہ کو پا کر سلطنت کو بھی بھول گیا۔ اس کو بغیر نورجہاں کے ایک دم بھی چین نہ تھا۔

دربار میں ہو گیا تھا دستور — پیچھے ملکہ بھی بیٹھیں مستور
اور پشت پہ شہ کی ہاتھ رکھے — احکام تھے جاری ہوتے اس کے
ہونے لگی ملک میں ترقی — بڑھنے لگی قدر اہلِ فن کی
بیگم کو کمال شعر میں تھا — شہرہ تھا شجاعت و سخا کا
فیضی سے تھے سو بلیغ شاعر — دربار میں رہتے تھے جو حاضر
تھی نورجہاں کی زندگی یہ — نیکی کرے اس کی تھی خوشی یہ
کہتا تھا یہ شاہ سب سے ہنس کر — اک سیخ کباب مے کا ساغر
بیگم سے لیا ہے اور اپنی — میں نے اُسے بادشاہی دے دی
تھی عورتوں میں حسین عورت — مردوں میں بھی بہادری کی صورت
اور شاعروں میں وہ شاعرہ تھی — مانیں جسے سب وہ عاقلہ تھی
ایران سے تا خلیج بنگال — اور ملکِ دکن تا بہ نیپال
اِس ملکِ وسیع پہ ایک عورت — اِس خوبی سے یوں کرے حکومت
مدّاح ہوں غیر مُلک والے — کُل ہند اس کا لوہا مانے
وہ عقل تھی اک عنایتِ حق — وہ دور تھا اک رحمتِ حق

اور آگے بیگم کے تدبّر، حکمرانی، سیاست دانی، دلیری کے بیان کے بعد قابل مصنّف نے ان اشعار پر اس تاریخی اور دل پذیر مثنوی کو ختم کیا ہے:

یہ سب تو ہوا رہا نہ اک بھی — باقی نہیں خاک بھی کسی کی

وہ کیا نہ رہا کوئی شہنشاہ — فانی ہے یہ ملک وحشمت و جاہ
اعظم تو سبق لے اِس بیاں سے — کیا کیا گئے لوگ اس جہاں سے
اکبر سے رہے نہ شاہ زندہ — قصہ ہی رہا ہے آج ان کا
باتیں بھی نہیں رہیں گی ان کی — اللہ فقط رہے گا باقی

اگر نواب اعظم کی عمر وفا کرتی اور عمرِ طبیعی کو پہنچتے تو یقیناً اپنے ادبی کارناموں سے اب وجد کے نام کو چار چاند لگاتے۔

کلام اعظم

کیا ہو سکے اللہ بیاں تیرے کرم کا — جھکتا ہے ترے سجدے میں سر میرے قلم کا

شوقِ نعتِ مصطفیٰ دل میں مرے پیدا ہوا — کیا منوّر نورِ ایماں سے مرا سینہ ہوا

یہ لوکس کی ہوں میں پروانہ کس کا — کیا عشق نے مجھ کو دیوانہ کس کا

کبھی مہرباں مجھ پر جو میرا نگار ہوتا — مری جان صدقے ہوتی مرا دل نثار ہوتا

سوزِ فراق یار نے لاکھ ہمیں جلا دیا — شوقِ وصال نے مگر مرنے پہ بھی جلا دیا
شہد سے خوشگوار تھا شوق سے نوشِ جاں کیا — زہر بھی اپنے ہاتھ سے اُس نے اگر پلا دیا

جلے گا کوئی دن میں سارا زمانہ — مرے سوز کا تم اثر دیکھ لینا
بُری اعظمِ خستہ تن کی تھی حالت — ملے گی نہ اچھی خبر دیکھ لینا

اچھا نہیں ہوتا کبھی انجام محبّت — ہرگز نہ کوئی بھُول کے لے نام محبّت

کرنے کو طوافِ حرمِ کوئے صنم اب
ہم باندھتے ہیں شوق سے احرامِ محبت

گھر میں مرے وہ آجائیں کاش
با اثر ہوں مری دُعائیں کاش

جور و جفا جو کرتا ہے ایجاد رات دن
اُس شوخ کا بھی ہو نہ کہیں آسماں سے ربط

تیرے رُخ کی سی ضیا مانگے کہاں سے لائے شمع
گر یہ دعویٰ وہ کرے محفل میں منہ کی کھائے شمع

اک دل ہے اور رنج زمانہ ہے بے شمار
صدمے ہزار غم کے کیونکر اُٹھائے دل

پڑھی ہم نے غم کی کتاب اوّل اوّل
ملی خونِ دل کی شراب اوّل اوّل

راہِ اُلفت میں لٹا ہوں عشق میں برباد ہوں
جس کی نکلی ہی نہیں حسرت میں وہ ناشاد ہوں

دشمنِ دیں، دشمنِ دل، دشمنِ جانِ حزیں
کیا قیامت آفریں ہے وہ نگاہِ سرمگیں

چال میں اندازِ محشر اور فتنے بات میں
اک نرالی بات ہے اُنکی تو ہر اک بات میں

تلخیاں اُلفت کی دردِ دل کا درماں ہو گئیں
آرزوئیں مرگ کی جینے کا ساماں ہو گئیں
چرخِ کج رفتار کا جور و ستم ہے آشکار
ہائے کیا کیا صورتیں نظروں سے پنہاں ہو گئیں
شعر ہیں یہ آپ کے اعظمؔ کہ ہیں سحرِ حلال
میرؔ اور سوداؔ کی غزلیں اُن پہ قرباں ہو گئیں

یہ مانا ہم نے اعظمؔ ہے بُری دلدار کی فرقت
نہ آئیں گر تو کیا ہے جب ہمارے دل میں رہتے ہیں

بزم میں تیری بیٹھے ہم گر کبھی آئے دلربا
اُس میں کسی کا ہرج کیا کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

چھوڑی مے کس ساقیٔ مہ وش کے سوزِ ہجر میں
اعظم اب تو آپ کو ہم پارسا کہنے کو ہیں

عشق کے دفتر میں یارب نام جن جن کا ہو
واسطے ان کے لقب محشر میں مومن کا نہ ہو
کیونکر اس شاہِ بتاں کی ہو سکے اعظم صفت
کافی جس کی مدح میں دیوان مومن کا نہ ہو

صنم و نازنیں، مہ جبیں ہو مہ لقا تم ہو
نہیں جس کی جفا کا شکوہ ایسے دلربا تم ہو

چلے تھے حالِ دل دلبر سے کہنے
قدم جوں جوں بڑھے جرأت گھٹا کی
گئے سب چھوٹ اعظم اور ساتھی
مگر اِک سوزِ ہجراں نے وفا کی

مدت ہوئی کرتے ہوئے تعریف بتوں کی
ہوگا مری قسمت میں کبھی حج کا سفر بھی

اللہ رے دلفریبیٔ چشم بتاں کہ جاں
بیتاب ہو کے جانب تیرِ نظر گئی

فلک کہنے لگا جس کو زمانہ
دھواں آہوں کا یہ پھیلا ہوا ہے
نرالی چال کی ایجاد اُس نے
نیا اندازِ نقشِ پا ہوا ہے
اسی بدعہد پہ آیا ہوا ہے
دلِ ناداں تجھے یہ کیا ہوا ہے
کوئی ڈھونڈے تو اُس کی رہ گذر میں
ہمارا دل وہیں کھویا ہوا ہے

وہاں ہو رہے ہیں مسرت کے ساماں
یہاں زیست پر بھی مری گفتگو ہے

کنجِ تنہائی میں ساتھی مرے ارماں ہوں گے　　داغ سینے کے چراغِ شبِ ہجراں ہوں گے

اک نام سا جہاں میں آنے کا کر گئے　　دن کیسے جلد عمر کے اپنی گذر گئے
دنیا کہیں اسے کہ کہیں کارواں سرائے　　آئے جو شام صبح کو وہ کوچ کر گئے
باقی ہے کون سوزِ محبّت سے آشنا　　گنتی کے دل جلے تھے وہ افسوس مر گئے
سمجھو نہ ہم کو بیٹھے ہیں بیزار زلیست　　سمجھو کہ زندگی میں جہاں سے گذر گئے
اعظم خدا کے واسطے اُس زُلف کو نہ چھیڑ　　ہوں گی خرابیاں جو وہ کاکُل بکھر گئے

اپنے والد گرامی قدر نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا کی مدح میں قطعہ نواب اعظم نے کہا ہے۔

قطعہ

جہاں میں فرخِ ذی جاہ سا امیر نہیں　　کہ جس کے جود و سخا کی کوئی نظیر نہیں
وہ کون شخص ہے سارے جہاں میں اعظمؔ　　جو سر امیر کے الطاف کا اسیر نہیں

اپنے بہنوئی نواب ابراہیم علی خاں[1] والئی پٹودی کی مسند نشینی پر نواب صاحب نے یوں تہنیت کے پھول برسائے :

گلستانِ پٹودی میں الٰہی　　یونہی رکھیو بہارِ دائمی کو
ترا احسان ہے یارب کہ تو نے　　دکھایا آنکھ سے ایسی خوشی کو
ادا ہو کس طرح حقِ نوازش　　کیا نواب ابراہیم علی کو

---

[1] نواب ابراہیم خاں سے نواب اعظم کی بہن اور نواب سر امیر الدین احمد خاں کی تیسری صاحبزادی شہر بانو بیگم منسوب تھیں۔ ان کے ہی صاحبزادے افتخار علی مرحوم کرکٹ کے مشہور کھلاڑی تھے۔ لوہارو اور پٹودی میں قرابت داری کا سلسلہ چلتا رہا۔

مرزا اعتماد الدین احمد خاں
شاہجہاں مرزا

شاہجہاں مرزا ابنِ اعزاز الدین شاہ رخ مرزا خلف نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اعتماد الدین احمد خاں شاہجہاں مرزا کی ولادت ۲۱ مئی ۱۹۱۱ء دہلی میں ہوئی۔ وفات ۱۹۷۷ء کراچی میں پائی۔ ان کی شادی نواب اسحاق خاں خلف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی پوتی سے ہوئی۔

شاہجہاں مرزا نے باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ دل بہلانے کے کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ اوائل عمری میں اپنے چچازاد بھائی نواب امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کے تقریباً دو سال اے۔ ڈی۔ سی رہے۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فوج میں ہو گئے۔ اور ۱۹۴۷ء میں کراچی انھوں نے ہجرت کی، وہاں میجر کے عہدے تک ترقی پا کر صحت کے ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے پنشن لے لی۔

نمونہ کلام یہ ہے

حمد کے چند اشعار ہیں:

اے خدائے وحدہٗ لاشریک اسے کیا کہیں یہ محال ہے
نہ تھا کوئی بس تری ذات تھی کسے اپنی سمجھ کی مجال ہے

تری ذات تھی تری ذات تھی اگر تھی تو بس تری ذات تھی
جو تھی ماورائے صفات پاک وہ بلند وہم وخیال ہے

بھلا کیوں کسی سے ڈریں ہم جو کہا ہے تو نے کہیں گے ہم ہمیں کہہ رہا ہے قرآن پاک، یہ یقیں دل سے کریں گے ہم
یہ تو تو نے ہم کو بتایا ہے کہ تو نور ہے نور، نور ہی نور بھلا عقل سمجھے گی فرق کیا، تجھے اللہ اللہ کہیں گے ہم

سرورِ دو عالم کی شان میں اشعار ہیں :

مظہرِ نورِ حق، شاہِ خیر الانام ایسے آقا پہ لاکھوں درود و سلام
خلق آدم ہوئے اور نیابت ملی ساری دنیا کی ان کو خلافت ملی
سب سے بالا و برتر محمدؐ کا نور اس کو اللہ سے یہ امانت ملی
مدح خواں بن گئے جن و انساں تمام ایسے آقا پہ لاکھوں درود و سلام

معراج کی رات

زمیں تا فلک انتظام اللہ اللہ یہ کس کے لیے اہتمام اللہ اللہ
صف آراستہ ہر طرف ہیں ملائک ہیں حوریں وہاں خوش خرام اللہ اللہ
بنی آج فردوس دلہن اِک ایسی حیا سے ہے وہ لالہ فام اللہ اللہ
زمیں، بحر و بر، ہر شجر اور ہر حجر بھی ہیں ساکن بصد احترام اللہ اللہ

اب چند غزلوں کے اشعار دیکھیے :

پاداشِ جرم کیا ہے جو وہ دربدر ملے آخر کہیں تو اس کو تری رہ گزر ملے
ہر گام مجھ کو سیکڑوں خستہ جگر ملے ہر سنگِ در پہ سیکڑوں آشفتہ سر ملے
یوں تو ہمیشہ بھیج کے قاصد بلاتے ہیں جانے کا لطف جب ہے کہ وہ منتظر ملے
منزل میری تلاش میں میں تیرے پاس ہوں اس شوقِ جستجو کا مجھے یہ ثمر ملے
مرنے پہ اعتماد بھلا کس طرح نہ ہو وعدہ یہی ہے حشر میں ملنے کا گر ملے

کیا بتائے کیا کہے، کہنے کا کس کو ہوش ہے سر بسجدہ کب سے چوکھٹ پر تری بے ہوش ہے
پا بریدہ، دل شکستہ، چشم تر، لب پر سکوت انتظارِ دید ہے اتنا ابھی تک ہوش ہے
عقل کی اس خود فریبی پر نہ کر تو اعتماد دل کا سودا ہو چکا اب ہوش خود با ہوش ہے

آنا جانا تھا ہمیشہ کا نہ آنا کیسا — دل میں ہو کر بھی مجھے دل سے بھلانا کیسا
میرے ہو کر نہ ہوئے میرے مجھے کس سے گلہ — مجھ کو کیا حق ہے کہوں ہائے زمانہ کیسا
برہمی کاکل پیچاں کی خدا خیر کرے — آج زلفوں میں جو الجھا ہے یہ شانہ کیسا
جانے پہچانے بھی اب غیر نظر آتے ہیں — ہائے ہنگامۂ محشر کا بہانہ کیسا
آخرش دل ہی تو ہے جس سے تعلق ہے انھیں — میرے گھر ان کو تو آنا ہے نہ آنا کیسا
آخرش موت مداوائے غم و یاس سہی — بیٹھے بٹھلائے نیا روگ لگانا کیسا
وہ بلائیں ہیں نہ جاؤں یہ کہاں ممکن ہے — اعتماد آئے نہ آئے نہیں جانا کیسا

اس کی خوشی اگر ہے تو تو زہر پی کے دیکھ — مرنا تو ایک دن ہے مگر پھر بھی جی کے دیکھ
کب تک اشک ریزی ہے ہجر و فراق میں — دامانِ تار تار کو چاہے تو سی کے دیکھ
اے شوقِ بے پناہ ذرا منزل سے بچ کے چل — یہ جام تلخ و تیز ہے تو اس کو پی کے دیکھ
کیسے یقیں نہ آئے نہ ہو کیسے اعتماد — آئے نظر جو مر کے اسے کیسے جی کے دیکھ

شاہجہاں مرزا کو کراچی کے شاندار شہر میں لوہارو کی یاد نے ستایا تو انھوں نے بے ساختہ ایک نظم لوہارو کی نذر کی:

بات کیا ہے کہ تو پھر بات بنانے آئی — میرے ماضی تو مجھے کیا خواب دکھانے آئی
وقت نے جس کو بھلایا تھا بڑی مشکل سے — داستاں پھر سے مجھے کیوں تو ستانے آئی

پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

وہ لوہارو کہ نہ تھا کوئی بھی ثانی اس کا — ذرہ ذرہ تھا خوش آئند کہانی اس کا
رہ گزاروں پہ چمکتے تھے ہزاروں خورشید — شب کو بکھرے ہوئے تاروں کا سا دھوکا ہوتا

پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

دھولیہ کنواں ہیں کوثر و تسنیم وہاں — تشنگی رفع وہاں گرمی تھی دو نیم وہاں
ہر روش گاجر مولی سے مزین ممتاز — دعوت ہمیں باعثِ تسلیم وہاں

پھر یاد لوہارو کی ستانے آئی

گاہے گاہے کبھی برسات کی رُت آتی تھی　　خشک افسردہ جبینوں پہ چمک آتی تھی
اور ٹیلے جو چمکتے تھے تمازت سے دنوں　　ٹھنڈے ہو جاتے تھے ان میں سے مہک آتی تھی
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

بارشوں میں سبھی جاتے تھے کلانہ جوہڑ　　نیلگوں پانی سے لبریز کلانہ جوہڑ
اونچی شاخوں میں درختوں کے جو جھولے پڑتے　　پینگیں بڑھتی تھیں جہاں وہ تھا کلانہ جوہڑ
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

اس کے اطراف میں پریوں کا اکھاڑہ جمتا　　قہقہے رقص کناں وقت کا دھارا تھمتا
دوڑیں لگتی تھیں، وہاں آنکھ مچولی ہوتی　　حسنِ مستانہ ہر اک گام مچلتا پھرتا
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

بھاگتے میں جو کبھی سر سے دوپٹہ اڑتا　　یا الجھ کر جو کہیں کانٹوں میں کرتا پھٹتا
اُوئی کی ایک صدائے مترنم خوش کن　　دلِ مضطر کے لیے گہرا یہ نشتر لگتا
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

فاصلہ دور نہ تھا ایک پہاڑی تھی وہاں　　حسن اور عشق کی ایک سوت بھی جاری تھی وہاں
رشکِ افلاک پہاڑی پہ بنا تھا مندر　　بدرِ کامل کی طرح دیوی بھی رہتی تھی وہاں
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

ایسی دیوی کہ ہزاروں دل و جاں اس پہ نثار　　اس کی آنکھوں میں قیامت کا نشیلا سا خمار
اک بت کافر ادا سنگ دل و جاں تھی وہ　　آرزو اور تمنا کی وہ تکمیل بہار
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

محفلِ رقص و سرود و طرب و عیش و نشاط　　ماہتابی پہ ہر اک شب کو یہی عیش و نشاط
دل میں اک دنیا بسی تھی ہمیں معلوم نہ تھا　　ہم تھے مسحورِ طلسمِ سحرِ عیش و نشاط
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

دن کٹے، راتیں کٹیں، ایک زمانہ گزرا　　خواب میں بھی نہیں آتا یہ فسانہ گزرا
میری ماضی کے حسین نقش مٹے جاتے ہیں　　صبحِ امید کو گزرے بھی زمانہ گزرا
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

سچ بتا مجھ کو تو کیا بات سنانے آئی پھر سے لے چلنے کو تو مجھ کو منانے آئی
روح میری تو وہاں اب بھی پھرا کرتی ہے جسم و جاں بھی میری قربان کرانے آئی
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی

اے لوہارو تری اب یاد سے کیا ہوتا ہے جو نہ ہونا تھا ہوا اب بھلا کیا ہوتا ہے
وطنِ مادر ہے میرا چین دل و جاں کا میرے لے یہ فرزند بھی تجھ پہ سے فدا ہوتا ہے
یادِ خفتہ مجھے بیدار کرانے آئی
پھر مجھے یاد لوہارو کی ستانے آئی



نواب امین الدین خان ثانی (والیٔ لوہارو)

نواب امین الدین احمد خاں ثانی

نواب امین الدین احمد خاں ثانی شہریار مرزا لوہارو کے آخری نواب اپنے نامور اجداد کی طرح ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت ۲۳ مارچ ۱۹۱۱ء ہے۔ اپنے مرحوم والد کے بعد ان کی مسند نشینی ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء کو سولہ سال کی عمر میں ہوئی۔ اختیارات ۲۱ جنوری ۱۹۳۱ء کو ملے اور فروری ۴۸ء میں اور ریاستوں کے ساتھ ریاست لوہارو بھی ختم ہوئی۔

نواب شہریار کے عہد میں لوہارو نے کافی ترقی کی۔ ریل لوہارو تک پہنچنے لگی۔ اناج کی منڈی بھی بن گئی اور مسجد و مندر کے علاوہ کچھ نئی عمارتیں بھی بنیں۔

نواب صاحب نے بالکل نوعمری میں اپنے لکھنے کی ابتداء ایک معاشرتی ناول سے کی۔ اس ناول کا نام 'فانوسِ خیال' ہے اس کے بعد شیر کے شکار پر ایک بہت طویل مضمون لکھا اور کچھ افسانے بھی۔ لیکن ان کا ایک خاص ادبی شاہکار مثنوی "انبساط و انتشار" ہے جس میں نوابانِ لوہارو اور ریاست لوہارو کے متعلق تمام معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ بقول ان کے:

یہ مضموں یہ اجداد کی داستاں　　برائے عزیزاں ہوئی ہے بیاں
وہ باتیں جو محبوسِ سینہ رہیں　　عزیزوں سے مخفی خزینہ رہیں
یہی مصلحت اب ہے زیرِ نظر　　کہ احوال اسلاف کی ہو خبر

پھر آگے تعارفی اشعار میں وہ کہتے ہیں:

رخِ وقت سے اٹھ رہا ہے نقاب · گزشتہ زمانہ ہوا ہے بے حجاب
نئے جام میں شراب کہن · ہے نغمہ نیا اور رباب کہن
گزشتہ زمانہ نگاہوں میں ہے · قدم میرا ماضی کی راہوں میں ہے
میرا دل ہے اس داستاں کا امیں · جو گوشِ سماعت سے محرم نہیں
مگر اس سے پہلے کہ آگے بڑھیں · بنا کیا ہے اس داستاں کی سنیں
فسانے کی تشکیل کیوں کر ہوئی · عزائم کی تکمیل کیوں کر ہوئی
یکایک تصور میں کون آ گئے · جو تخ بستہ سینے کو گرما گئے
بتاؤں تمہیں کون ذیشان تھے · جو قالب تھے تین اور یک جان تھے [1]
یہی نامور اپنے اجداد ہیں · یہی باعثِ نظمِ روداد ہیں

نواب شمس الدین احمد خاں والئ جھرگا فیروز پور کے پھانسی پانے کا حال بہت درد انگیز طور پر نظم کیا ہے:

بروزِ شہادت بہ غسل و وضو · نمازِ سحر سے ہوئے سرخ رُو
ملا عطر ملبوس میں خوش گوار · ہوئے منتظر پالکی میں سوار
چلے جب تو عالم ہوا اشکبار · ہر ایک کو دلاسہ دیا بار بار
لب راہ اک خوانچے والا بڑھا · کیسرو کیے پیش کچھ دودھیا
یہ مرغوبِ خاطر تھے فوراً لیے · وہیں چلتے میں نوشِ جاں بھی کیے
بڑھے اس کو دینے خسرا اشرفی · کیسرو کی قیمت جو دی جاتی تھی
کہا خوانچے والے نے رو کر "میاں · جو کام آئے حاضر کروں اپنی جاں"
میں آقا سے اپنے مول لوں حیف ہے · مجھے اب تو جینا بھی بے کیف ہے
معین تھا انگریز افسر وہاں · وہ کرتا ہے یوں واقع کو بیاں
اتر پالکی سے بڑھے میرے پاس · یہ نواب بے خوف اور بے ہراس

---

[1] نواب قاسم جان۔ نواب عارف جان۔ نواب عالم جان ــــ نواب موصوف کے اجداد

کہا "دیں ہٹا آپ جلاد کو — نہیں چاہتا میں نجس پاس ہو
ہٹا وہ، سوئے دار خود ہی بڑھے — رسن چوم کر پھر وہ کہنے لگے
ترا شکر اللہ کیوں کر کروں — ترا بندہ ہوں رُو بہ قبلہ بھی ہوں
اشارہ کیا میں منہ پھیر کے — کہ باقی نہ تھی مجھ میں تابِ نظر

اس مثنوی میں ایک شادی[1] پر کچھ اشعار دیکھنے کے قابل ہیں :

محل میں تھی ہر وقت یہ گفتگو — کہ دختر کے رشتے کی ہو جستجو
جو مشہورِ عالم ہو، وہ بَر ملے — مطابق گھرانے کے شوہر ملے
شرافت منش صاحبِ عز و جاہ — امیر و کبیر و حکمت پناہ
لوہارو کی شہرت پر اور نام پر — لگے آنے پیغام و پیغامبر
ہوئے منتخب والیٔ مانگرول — یہاں سے ہوا قدرِ دختر کا قول
برات آئی پھر کاٹھیاواڑ سے — بہت چرچے تھے جس کی تقریب کے
دو اسپیشلوں سے براتی تمام — بھوانی میں اترے بصد احتشام
یہ مہمان لوہارو کی جانب چلے — سواری میں رتھ لینڈو گھوڑے تھے
خوشی کے پھریرے اڑاتے ہوئے — حدودِ لوہارو میں داخل ہوئے
بھوانی سے پہلے یہ تھا انتظام — وہیں جمع تھے قصبے کے خاص و عام
وہاں بینڈ کی تھیں دھنیں دلربا — بڑی پُر مسرت بڑی جانفزا
وہ ہر سمت شہنائیوں کی صدا — نکلتی تھی بن کر دلوں کی دعا
بڑھے جوش کے ساتھ جو میزباں — بغل گیر ان سے ہوتے میہماں
اُدھر بھی رئیس اور اِدھر بھی رئیس — وہ اِک دوسرے کے رفیق و انیس
ہنسی قہقہوں سے جو گونجی فضا — مسرت کی لہروں کا کیا پوچھنا
مبارک سلامت اک شور تھا — مدارات کا ہر طرف زور تھا

---

[1] نواب سر امیر الدین احمد خاں کی بڑی صاحبزادی فخر النسا بیگم کی شادی کا ذکر ہے۔

کچھ اس شان سے خیر مقدم ہوا
کہ رشتہ محبت کا محکم ہوا

یہ خوش نظمی کا اب سنیں آپ حال
کہ ہر شے کا رکھا گیا تھا خیال

ملازم تھا راجہ کا اک منچلا
تو وہ مہتمم سے یہ کہنے لگا

کہ راجہ کے گھوڑے کو نزلہ ہوا
مجھے سیر بھر زعفران دو منگا

یہ پہنچی خبر ناظمِ نیک کو
کہا بوری ساری وہاں بھیج دو

یہ کہنا اسے ساتھ رکھیو مدام
کہ تا عمر گھوڑے کے آجائے کام

جوں ہی دولہا تشریف آور ہوئے
زر و سیم و گوہر نچھاور ہوئے

جو منہ بند تھیں تھیلیاں کھل گئیں
بنا کانِ زر روئے فرشِ زمین

جو رسمیں مع عقد سب ہو چکیں
مبارک سلامت کی دھومیں پڑیں

بڑھے دولہا تسلیم کو ساس کی
سلامی ملی اک ہزار اشرفی

دولھن پالکی میں ہوئی جب سوار
اٹھانے لگے اس کو جس دم کہار

کہا کھیتڑی راجہ صاحب نے تب
اٹھائیں گے ہم پالکی مل کے سب

رئیسوں کے کاندھوں پہ با التزام
اٹھی پالکی اور چلی چند گام

کچھ اس شان و شوکت سے شادی ہوئی
نہ بھولے گی تاریخ اس کو کبھی

اپنے والد گرامی قدر نواب اعزالدین احمد خاں اعظم مرزا کے دورِ حکومت کا ذکر بہت خوبی سے نظم کیا ہے۔

عجب عہدِ اعظم کا ہے ماجرا
عجب دور تھا خوشنما خواب سا

ولی عہدی سے ہی کیے ایسے کام
کہ روشن ہوا جن سے دنیا میں نام

زمین کا جھمیلہ ریاست کا قرض
لیے اپنے ذمے یہ جتنے تھے فرض

زمیں کا ہوا اس طرح بندوبست
کہ مسرور تھے سب بلند اور پست

ہوا اس سے دوگونہ یوں فائدہ
زمیندار خوش مالیانہ بڑھا

سیاست سے حکمت سے تدبیر سے
نگہداری حسنِ تقدیر سے

سحر کے کنول مسکرانے لگے
قدم شب کے پھر ڈگمگانے لگے

ہر اک رہ گزر بن گئی کہکشاں
چمکنے لگے منزلوں کے نشاں

وہ گزرے اسی طور چودہ برس   سنوارا ریاست کو بے پیش و پس
قرینے کا ہر کام، ہر شے درست   ملازم ادائے فرائض میں چست
امیروں کی عزت کا تھا پاس بھی   غریبوں کی غیرت کا احساس بھی
نظر میں وقارِ حکومت بھی تھا   بہت پاسِ حسنِ عدالت بھی تھا
یہاں منصفی کا طریقہ بھی تھا   کرم گستری کا سلیقہ بھی تھا
شجر عدل و انصاف کا بارور   کہ شیر اور بکری تھے اِک گھاٹ پر
چمن میں کسی کو شکایت نہ تھی   سبھی مطمئن گل بھی اور خار بھی
یہ تھا عہدِ اعظم کا حسنِ نظام   سحر کیف زا تھی دل آرا تھی شام

مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ

مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے پوتے اور نواب شہاب الدین خاں ثاقبؔ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ تاباںؔ نے شعر و ادب کا ذوق میراث میں پایا تھا۔ لیکن طبیعت لاابالی تھی۔ دو دیوان اُن کے تھے، لیکن میرے ہاتھ ایک مختصر کلیات آئی۔ حسین علی خاں شاداںؔ سے اصلاح تاباںؔ نے اپنے کلام پر لی۔ ان کی شادی باقر علی خاں کاملؔ کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان عرف جندو بیگم سے ہوئی تھی۔ یہ وہی جندو بیگم ہیں جن کو پیار سے غالبؔ مرزا جیون بیگ کہتے تھے اور ان کی پیدائش پر قطعہ کہا تھا، جو سبدِ گل میں موجود ہے۔ تاباںؔ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی اور اپنے خاندانی ہرواڑ کوٹھی مرزا بابر والی قطب صاحب میں دفن کیے گئے۔

تاباںؔ کو ریاست لوہارو سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وثیقہ ملتا تھا۔ اتنی ہی آمدنی تقریباً جدی جائداد کے کرایے سے تھی۔ سو روپے ماہوار حیدرآباد سے بھی منصب ملتا تھا۔ اس لئے فکرِ معاش سے تاباںؔ کا تعلق نہ تھا۔ ان کے محبوب مشاغل دو ہی تھے۔ شعر کہتے یا شطرنج کھیلتے۔ تاباںؔ کے دوستوں میں حکیم اجمل خاں، حکیم عبدالمجید خاں، نواب فیض احمد خاں، خواجہ عبدالمجید، پنڈت امرناتھ ساحرؔ شامل تھے۔ تاباںؔ بہت زندہ دل اور رنجان مرنج انسان

تھے۔اس لئے ہر وقت اِن کے دیوان خانے میں دوست احباب آتے جاتے رہتے۔باہر سے بھی دوست اور عزیزان کے کافی دن ان کے ہاں قیام کرتے تھے۔خواہ خرید و فروخت کے لئے آئیں یا سیر و تفریح کے لئے یا بہ غرضِ علاج۔تاباںؔ ہر ایک کی بہ خندہ پیشانی خاطر مدارات کرتے۔ان کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات مانگنے والوں کو تن کے کپڑے بھی اتار کر دے دیتے تھے اور مزاج میں اس قدر سادگی تھی کہ امراء و روٗسا سے لے کر معمولی آدمی تک سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔اس لئے سارا شہر ان کو استاد کہتا اور احترام کرتا تھا۔تاباںؔ کو غصہ بہت جلدی آجاتا تھا۔اکثر غصے میں جو منہ میں آتا لوگوں کو کہہ بیٹھتے مگر ان کو مخلص اور بزرگ سمجھ کر سبھی ان کی گالیاں سن لیتے تھے۔حکیم اجمل خاں کو تو تاباںؔ سے گالیاں سننے میں کچھ ایسا لطف آتا تھا کہ اکثر خود جان کر چھیڑتے۔شہر میں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا تو اس میں تاباںؔ اور سائلؔ دونوں بھائی جاتے تھے۔لیکن سائلؔ کا ایک تو کلام رچا ہوا، دوسرے دلپذیر ترنم، بانکی سج دھج سے اس طرح پڑھتے تھے کہ واہ واہ کے شور سے مشاعرہ گونج جاتا۔چھوٹے بھائی کی اس کامیابی پر بھنا کر تاباںؔ اکثر گالیاں دیتے ہوئے مشاعرے سے اٹھ جاتے اور حکیم اجمل خاں کے پاس صبح ہی پہنچ کر داغؔ کو گالی دے کر کہتے "یہ سائلؔ بالکل داغی بن گیا ہے۔جب ہی تو بازاری انداز کے شعر کہتا ہے اور نرتے کر کے گاتا ہے، میں بھلا کیسے یہ بھانڈ پنا کر سکتا ہوں میں نے غالبؔ و نیرؔ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ان کے رنگ میں شعر کہتا ہوں۔"

حکیم صاحب سر جھکا کر موٗدب انداز سے کہتے "بجا فرمایا استاد! مگر یہ حقیقت ہے کہ سائلؔ بھائی کی غزل بہت اچھی تھی۔مشاعرہ انھوں نے لوٹ لیا۔معاف کیجیے۔آپ کے اشعار میں علمیت سہی لیکن تخیل کی رنگ آرائی نہیں ہوتی۔" نواب تاباںؔ جھوم کر مغلظات حکیم صاحب کو سناتے۔حکیم صاحب گالیاں سن کر اس طرح مسکراتے رہتے جس طرح ان کی تعریف کی جا رہی ہو اور سننے والے کانوں میں انگلیاں دے لیتے۔مگر ان کی تیوری پر بل بھی نہیں آتا اور تاباںؔ یہ کہتے ہوئے اٹھ جاتے "آئندہ جو تم سے ملے وہ اپنے باپ کا نہیں۔"

مگر دوسرے روز شام کو حکیم صاحب ان کے یہاں پہنچ جاتے اور نواب تاباںؔ کل کے غصے کو بھول کر ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔گلے لگا کر کہتے "میں تم کو یاد ہی کر رہا تھا خوب

وقت پر آتے۔ آؤ ایک دو بازیاں ہو جائیں۔"

نمونۂ کلام:

یہ ہم نے سنا چمکا ہے تاباںؔ کا مقدر ذرّہ وہ بنا نیّرِ تابانِ حرم کا

فرماتے ہیں:

سلامی ازل سے میں شبیر کا ہوں نہ پوچھو کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں
محبت کی دنیا کا اہلِ وفا ہوں غلام غلامانِ آلِ عبا ہوں

دوسرے سلام میں شاہِ شہدائے کربلا کے لئے تاباںؔ نے بہت ڈوب کر کہا ہے:

اے سلامی جب سفر کی ٹھان لی شبیر نے مژدۂ شوقِ شہادت دے دیا تقدیر نے
مومنوں کے قلبِ مضطر پر یہ تاباں ہو گیا حال عاشورہ جو ظاہر کر دیا تفسیر نے

تاباںؔ نے غالبؔ کی زمین میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ کہا ہے:

اس کی شانِ گوناگوں ہم پر نمایاں ہو گئیں کیسی کیسی صورتیں پیدا و پنہاں ہو گئیں
اس کے پرتو سے ہے ان میں جلوہ ہائے رنگ رنگ میری آنکھیں روکشِ رخسارِ جاناں ہو گئیں
دن کو مخفی تھی نبات النعش کی بازی گری رات کے پردے میں کھل کھیلیں کہ عریاں ہو گئیں
نیّرِ غالبؔ کا تاباں تو ہی ہے زلّہ ربا تجھ سے ذرے پر شعاعیں ان کی تاباں ہو گئیں

سہرا کہنے پر تاباںؔ کو خاص قدرت تھی، ان کے عزیز دوست حکیم اجمل خاں کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی حکیم محمود سعید خاں خلف اکبر حکیم غلام کبریا خاں سے ہوئی تو تاباںؔ نے غالبؔ کے رنگ میں سہرا پڑھا۔

یوسفِ مصر بنا حسن کا پیکر سہرا حورِ فردوس بنی نور کی چادر سہرا
مشتری و زہرہ باہم آرسی مصحف دیکھیں اے صبا چل کے الٹ دونوں کے سر پر سہرا
چمن کے گل سینکڑوں لایا ہے ارم سے گلچیں تو بھی مشکل سے بنا ہے تیرا گزبھر سہرا

نوٹ: خاندانِ لوہارو پر کچھ تو محمد بن حنفیہ کی اولاد میں ہونے کے باعث اور کچھ غالبؔ کا اثر ایسا تھا کہ جتنے بھی اس خاندان کے شعراء ہوتے سب نے ہی حضرت علیؓ اور جناب حسن حسین علیہ السلام کی مدح کی۔

تاباںؔ فارسی میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ جوان کے لئے بہ منزلہ مادری زبان کے تھی۔ نواب امین الدین احمد خاں ثانی المعروف بہ شہریار مرزا کی مسند نشینی پر تاباںؔ نے فارسی میں تہنیت لکھی۔ بڑے لطف و پیار سے نوخیز اور نوعمر نواب کو مخاطب کیا ہے:

[1] تا کے وزد نسیمِ سرِ لالہ زارِ ما — اکنوں دمید بہ شاخ گلِ نو بہارِ ما
یارب بہ علم و فضل کہ آئیدا میں دیں — یکتائے روزگار شود شہریارِ ما
تاباںؔ زباں کشود ترا شہریار گفت — فخرِ زمان و فخرِ زمیں افتخارِ ما

---

[1] پہلے مصرعے میں اپنے اس درد کا اظہار کیا ہے کہ تاباںؔ کے جوان العمر بھانجے نواب اعز الدین مرزا کا انتقال ہوا تو چودہ سالہ ولی عہد کی مسند نشینی ہوئی۔

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں کے بڑے صاحبزادے ۱۸۴۰ء میں تولّد ہوئے۔ تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر پائی۔ بہت ذہین اور متین انسان تھے۔ ان کی بیدار مغزی اور انتظامی قابلیت کی بدولت ان کو عنفوانِ شباب میں دہلی کا آنریری مجسٹریٹ انگریزی حکومت نے مقرر کر دیا۔ ثاقبؔ اپنی ذہانت کی بدولت غالبؔ کے محبوب شاگرد تھے۔ وہ اس جوان صالح کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ تخلص بھی شہاب کی مناسبت سے ثاقبؔ غالبؔ نے ان کو عطا کیا تھا۔ افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی، ۲۹ سال کی عمر میں غالبؔ کی وفات کے دو مہینے بعد دس مہینے تپ دق میں مبتلا رہ کر ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء مطابق ۶ محرم الحرام ۱۲۸۶ ہجری دوشنبے کے دن عصر کے وقت وفات پائی۔ غالبؔ کے جنازے کے ساتھ پیادہ پا چلنے کی طاقت نہ تھی، بخار میں مبتلا تھے۔ پاؤں پر ورم آ چکا تھا۔ پالکی میں نظام الدین تک اپنے مشفق استاد کو پہنچا کر آئے اور زبانِ حال سے کہا "آپ چلیں ہم بھی آتے ہیں۔"

ثاقبؔ کو قدم شریف میں سوتیلے چچا نواب شمس الدین احمد خاں کے قریب دفن کیا گیا۔ ان کی شادی نواب شمس الدین احمد خاں کی نواسی سکندر جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان سے پانچ بچے

ہوئے۔ مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں، بہاؤ الدین احمد خاں طالب[1]، سراج الدین احمد خاں سائل، ممتاز الدین احمد خاں مائل، اور ایک صاحبزادی اختر سلطان بیگم۔ تاباں اور سائل نے میدانِ ادب میں کافی شہرت حاصل کی۔

ثاقب کی تاریخ وفات قربان علی بیگ نے کہی:

از صدمۂ مرگِ ثاقبِ والا جاہ — ہر سو است نالۂ جانکاہ
تاریخ وفات او چنیں سالک — روزِ ششم، مہ محرم، صد آہ

نساخ نے تاریخ لکھی:

مر گئے شہاب الدین خاں — غم میں ہیں سب مومن و کافر
سال لکھا خامے نے وائے — حیف اشہاب ثاقب نیر

۱۲۸۶ھ

ثاقب نے نیر و غالب کی گود میں آنکھ کھولی۔ شعر و ادب ان کو گھٹی میں ملا۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس لئے ثاقب کا کلام مضمون آفرینی، معاملہ بندی اور تفکر و اخلاق کی چاشنی سے بھرپور ہے۔:

کیا چیر کے سینہ و دل دکھائیں — کچھ حال سنو تو ہم سنائیں
آتے نہیں یاں اگر نہ آئیں — اے کاش مجھے وہاں بلائیں
ہم سینہ سپر کئے کھڑے ہیں — وہ شوق سے خنجر آزمائیں
جو کام ہیں غیر کے ہوئیں صرف — افسوس وہ دل رُبا ادائیں
اے بخت کہاں تلک برآئی — اے چرخ کہاں تلک جفائیں
کل میں نے کہا کہ بندہ پرور — چہرے سے آپ نقاب اٹھائیں

---

[1] بہاؤ الدین احمد خاں طالب کی شادی نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کی بڑی صاحبزادی زبیدہ سلطان بیگم سے ہوئی تھی۔ طالب نے ۳۲ سال کی عمر میں ایک صاحبزادی محمود سلطان بیگم چھوڑ کر انتقال کیا۔ محمود سلطان بیگم کی شادی سر ذوالفقار علی خاں نواب مالیر کوٹلہ کے قریبی عزیز سے ہوئی تھی۔

کہتے ہیں ادا شناس باہم　　اچھا ہو، جو رخ تو کیوں چھپائیں
بولے رو داد موسئے وطور　　سن لی ہو تو دیکھنے کو آئیں
بسم اللہ ہم اٹھائیں پردہ　　پر ان سے کہو کہ تاب لائیں

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں　　بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں
غلط فہم ہیں عاشقان مجازی　　کہ محوِ تماشائے محمل ہوئے ہیں
رہیں گے گرفتارِ صورت پرستی　　اگر حسنِ معنی سے غافل ہوئے ہیں
ہمیں ذوقِ صحرا نوردی ہے ثاقبؔ　　نہ سمجھو کہ جویائے منزل ہوئے ہیں

رنجش سے گر گیا ہو تو ایماں نہ ہو نصیب　　کافر بتوں کو کہتے ہیں عشاق پیار سے

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اٹھائیے　　اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھائیے
بیٹھے ہیں ہم تو اب دلِ بے آرزو لیے　　وہ دن گئے داغِ تمنا اٹھائیے
ثاقبؔ وہ ضبطِ اشک کو سمجھے ہیں بے غمی　　یہ روئیے کہ شورشِ دریا اٹھائیے

کیوں وعدہ کرو بے خبر آجاؤ کسی وقت　　ہوں وصل کا خواہاں نہیں مشتاق خبر کا

نوٹ : اختر سلطان بیگم کی شادی نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا والیٔ لوہارو سے ہوئی۔ ان کے چار صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں۔ اب اختر سلطان بیگم کا پڑپوتا نواب امین الدین احمد خاں ثانی نواب لوہارو ہے۔

مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی

ابوالمعظم مرزا سراج الدین احمد خاں سائل شہاب الدین خاں ثاقب خلفِ اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کے تیسرے صاحبزادے تھے۔ سائل نے الّلوں تللّوں میں آنکھ کھولی۔ جاہ وحشم کی گود میں پرورش پائی۔ جمال ورعنائی، علم وفن، شعروادب، انھوں نے خاندانی ورثے کے طور پر پایا۔ دس سال کی عمر میں چاہنے والے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مگر شفیق دادا نے آنکھ کا تارا بنا کر رکھا۔ اپنے جیتے جی ان کا دل میلا نہ ہونے دیا۔ مثل مشہور ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"

سائل لڑکپن سے ہی اپنے دونوں بھائیوں سے زیادہ ذہنِ رسا اور جودتِ طبع رکھتے تھے۔ اس لئے یہ دادا کے بہت لاڈلے تھے۔ نواب نیّر کے دیوان خانے 'بیت الضیاء'[1] میں روزانہ شام کو مشاہیرِ علم وادب جمع ہوتے۔ تاریخ، ادب وفلسفہ وشعر غرضیکہ ہر علمی و ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ سائل ہمیشہ ہی اس بزمِ ادب میں موجود رہتے تھے۔ اس لئے کم سنی میں ہی ان کی معلومات میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اور علمی فضا نے ان کے ذہن پر جلا کر دی۔

---

[1] بیت الضیاء گلی قاسم جان میں ہے۔ اس میں دو تین سال قبل تک اخبار 'الجمعیۃ' کا دفتر تھا۔

میرؔی والدہ مرحومہ فرماتی تھیں "سنجھلے بھائی کو آتا جان بہت چاہتے تھے"۔ یہ ہمیشہ دوپہر کو ان کی پلنگڑی کے پاس فرش پر لیٹتے تھے۔ وہ جب چاہتے اِن سے شاہنامہ سنتے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق سائل صاحب نے بھی اردو، فارسی، عربی کی تعلیم لائق استادوں سے پائی۔ انگریزی بھی اتنی پڑھی تھی کہ بلاتکلف باتیں کر سکتے تھے۔ مشاعروں میں ترنم سے پڑھنے کا رواج سائل صاحب ہی نے عام کیا۔ لیکن ان کا سا دل پذیر اندازِ ترنم کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

میدہ اور شہاب رنگ، مغلئی خط و خال، لانبا قد، گداز جسم، سیاہ مخمل کی لیس لگی تاج نما ٹوپی، چکن یا نین سکھ کا سفید براق انگرکھا جیسے چنبیلی کے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو۔ اس سج دھج کے ساتھ جب دلی کی آبِ کوثر میں دھلی ہوئی زبان میں سائل دل نشیں انداز سے اپنا کلام سناتے تو ان کے اشعار کو حاصلِ مشاعرہ سمجھا جاتا سننے والے بیساختہ داد پر داد دیتے۔ فضا پر نشہ سا چھا جاتا۔ در و دیوار وجد کرنے لگتے تھے۔ نوعمری میں ہی سائل کی شاعری کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج گیا۔ جہاں کہیں بھی کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا منتظمین مشاعرہ بہت اصرار سے سائل صاحب کو بلاتے تھے۔ کیونکہ اس دور کا کامیاب مشاعرہ وہی سمجھا جاتا تھا جہاں سائل جاتے۔ ان کا عالم یہ تھا کہ جہاں بھی پہنچے، مشاعرہ انھوں نے لوٹ لیا خوش رُو، جوانِ رعنا سائل شعر پڑھتے ہوئے خود بھی دنیائے شعر و ادب کی تخلیق معلوم ہوتے تھے۔ عمر کی اکیس منزلیں طے کرنے سے پہلے ہی اس بلبلِ خوش الحان کی نواسنجیوں پر پورا ملک جھوم اٹھا۔ فن کار فطری طور پر حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔ سائل کو تو قدرت نے حسنِ صورت بھی دیا تھا اور حسنِ طبیعت بھی، اور پھر روپے پیسے کی بھی کمی نہ تھی۔ دادا کی آنکھ بند ہوتے ہی طرح دار رنگین مزاج سائل کھُل کھیلے۔ شاعری کی شہرت کے ساتھ ان کی رنگ رلیوں کا چرچا ہونے لگا۔

سمجھ دار اور عاقبت اندیش ماں نے یہی بہتر سمجھا کہ بیٹے کو شادی کی سنہری زنجیروں

لے رقیہ سلطان بیگم سائل صاحب کی سگی پھوپھی معظم زمانی بیگم کی چھوٹی بیٹی تھیں۔

میں باندھ دیا جائے۔ نواب ممتاز علی خاں والیٔ پاٹودی سے سائل کی چھوٹی خالہ منسوب تھیں۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی ہوگئی۔ سائل صاحب کو اپنی خالہ زاد سے پہلے کافی دلچسپی رہی۔ اِدھر اُدھر جانا چھوڑ دیا۔ بزرگوں کا اطمینان ہوا کہ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ سائل نئی نویلی دلہن کی نازبرداریوں میں دل و جان سے مصروف ہوگئے۔ لیکن یہ انہماک زیادہ عرصے نہیں چل سکا۔ ہوا یہ کہ بیوی سیدھی سادی صورت کی الہڑ خود پسند نواب زادی چاؤ چونچلوں میں آنکھ کھولی ہاتھوں چھاؤں پلی بڑھیں۔ میاں سے ہر وقت نازبرداری کی طالب رہتیں۔ ان کا پاؤں بھاری تھا اس لئے اور بھی چڑچڑی ہو رہی تھیں۔ بھلا سائل کب تک اپنی سادہ طرح بیگم کے ناز بیجا برداشت کرتے۔ خود اپنے حسنِ صورت اور حسنِ کمال میں محو تھے۔ آخر وہ میاں سے روٹھ میکے پاٹودی چلی گئیں۔ سائل صاحب بھی اکڑ گئے مگر جب فرزند دل بند ہونے کی اطلاع ملی تو ماں بہو پوتے کو دیکھنے جانے لگیں سمجھا کر ان کو بھی ساتھ لے گئیں۔ بچہ ہوبہو باپ پر تھا۔ اس گول مٹول پیارے بچے کو دیکھ کر سائل صاحب نے ایک مرتبہ پھر بیوی سے صلح کرلی اور ڈیڑھ مہینے بعد بیوی بچے کو لے کر دلی آئے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اتنا ہی پیارا بھی۔ سائل صاحب کو بیٹے سے عشق تھا۔ اس کی خاطر وہ باہر کے مشاعروں میں بھی اکثر نہیں جاتے تھے۔ بیوی بھی خوش رہتیں۔ ان کو اپنے رنگین طبع شوہر پر اب اعتماد سا ہو گیا تھا۔ مگر بچہ پانچ سال کا ہو کر تین دن میں چٹ پٹ ہو گیا۔ سائل صاحب کو بچے کی موت کے بعد بیوی سے نفرت ہو گئی۔ وہ اس کی موت کا باعث بیوی کی لاپرواہی کو ٹھہراتے تھے۔ آخر رنجش اتنی بڑھی کہ ان کی بیوی میکے جا بیٹھیں اور سائل صاحب نے بھی ان کو پھر نہیں بلایا، بالکل قطع تعلق کرلیا۔ بچے کا تاریخی نام معظم الدین احمد خاں سائل نے رکھا تھا۔ اس لئے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ ابوالمعظم لکھتے رہے اور اس نونہال کے غم کو بھولنے کے لئے انھوں نے پھر اپنے کو راگ و رنگ میں کھو دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف جائداد اس عیش و عشرت کی بدولت دو سال کے اندر ہاتھ سے نکل گئی۔

چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خاں کی صحت بھری جوانی میں شراب خانہ خراب کی لت نے بالکل تباہ کردی اور وہ چند مہینے کی علالت کے بعد راہیِ ملکِ بقا ہوئے، تو حسّاس طبع سائل کے دل پر جواں مرگ بھائی کی موت نے ایسی چوٹ پہنچائی کہ رنگ رلیاں بالکل چھوڑ دیں۔

اب ان کا زیادہ وقت نوعمر بیوہ بھاوج کی دل دہی اور یتیم بھتیجے کی ناز برداری میں گزرتا تھا۔ بھاوج سے ہمدردی نے محبت کی صورت اختیار کرلی۔ بھائی کی وفات کے ایک سال بعد انھوں نے اپنی بیوہ بھاوج لاڈلی بیگم سے نکاح ثانی کرلیا۔ جو نواب مرزا خاں داغ کی منہ بولی بیٹی تھیں ان بیوی سے ایسی موافقت ہوئی کہ پھر لہو ولعب کی جانب سائل نے رُخ نہیں کیا۔ ویسے بھی اب جوانی دیوانی کا دور گزر چکا تھا۔ روپیہ بھی اتنا نہیں رہا تھا کہ بغیر سوچے خرچ کیا جاسکے۔ بیوی تھیں بھی پیسے والی۔ ان کو داغ کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے تین سو روپے ماہانہ حیدرآباد سے منصب ملتا تھا۔ سائل صاحب کا منصب بھی داغ نے دو سو روپیہ ماہانہ حیدرآباد سے کرادیا۔ ان بیگم سے سائل صاحب کے تین بچے ہوئے۔ بڑی لڑکی قدسیہ سلطان بیگم اور دو لڑکے مرزا قطب الدین احمد خاں، مرزا نظام الدین احمد خاں۔ قدسیہ بیگم کی شادی لاہور میں جج عبدالرب سے ہوئی تھی۔ شادی کے چند سال بعد ہی ایک لڑکا چھوڑ کر وہ فوت ہوگئیں۔ نظام الدین احمد خاں بھی قابل اور ہونہار لڑکا تھا۔ افسوس یہ لائق نوجوان بھی سائل کو عین عالم شباب میں داغ مفارقت دے گیا۔ مرزا قطب الدین احمد خاں کی شادی اپنی بہن قدسیہ بیگم کی سوتیلی بیٹی سے ہوئی۔ انھوں نے تین بچے چھوڑ کر ۱۹۷۵ء میں انتقال کیا۔

انقلاب زمانہ ہر انسان کو بدل دیتا ہے۔ جس دلّی نے جوانِ رعنا سائل کا بانکپن دیکھا اُس دلّی نے یہ بھی چشم عبرت سے دیکھا۔ کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد بوڑھے اور معذور سائل رکشا پر بیٹھ کر روزانہ شام کو ایک چکر اردو بازار کا لگاتے، ملنے والوں سے اس طرح مل لیتے۔ اپنی حالت پر خود روتے اور دوسروں کو رُلاتے۔ لیکن اس عالم میں جب انھوں نے آخری مرتبہ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں غزل سنائی تو باوجود ضعف ونقاہت کے ان کی آواز کی دل کشی جوں کی توں تھی۔ غزل کا مقطع سائل نے حسبِ حال کہا تھا۔ ان کی سوز بھری، رسیلی، مترنم آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

پکڑ لائے سائل کو بزمِ سخن میں
بنی اس کے دم پہ یہاں آتے آتے

آخر ۱۹۴۵ء، ۱۵ ستمبر کو کاشانۂ نیّر کی یہ ٹمٹماتی شمع بھی گل ہوگئی۔ جہاں آباد کا وہ آخری

شاعر بھی اٹھ گیا جس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا۔ ہاں، ابھی ایک شاعر دلی میں ایسا ہے جو میر و غالب کی بساطِ ادب کا ہی مہرہ معلوم ہوتا ہے۔ سائل کے ساتھ وہ اقدار جن کی وجہ سے دلی دلی تھی ختم ہوگئیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ رجعت پرستی ہے مگر یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتی کہ ہماری تہذیب وہ شائستگی جو امارت کی گود میں پروان چڑھی ہے، خاتمے کے قریب ہے۔

سائل اسی تہذیب کے مکمل نمونہ تھے۔ جس میں رکھ رکھاؤ بھی تھا اور وضع داری بھی۔

کل شب کو بزمِ مے میں عدو کا میہماں نہ تھا
بگڑو نہیں، خفا نہ ہو، جانے دو، ہاں نہ تھا

برابر ہے جفا کیا ہے وفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا برا کیا

بزم میں عشاق کی ساقی نے کر دی خود تمیز
جام بھر کر رکھ دیا تیرا تمھارا آپ کا

دل میں ہے درد، داغ کلیجے میں لب پہ آہ
سائل کو جو نصیب سے ملتا گیا لیا

معلوم نہیں کس سے کہانی میری سن لی
بھاتا ہی نہیں اب انھیں افسانہ کسی کا

حرفِ مطلب سن کے سائل کا، شرارت سے کہا
ان کی صورت، ان کی جرأت، ان کا ارماں دیکھنا

اہلِ محشر دیکھ لوں، قاتل کو تو پہچان لوں
بھولی بھالی شکل تھی اور کچھ بھلا سا نام ہے

محتسب تسبیح کے دانوں پہ یہ ہی گنتا رہا
کن نے پی، کن نے نہ پی، کس کس کے آگے جام تھا

وعدہ کیا تھا آپ نے اور پھر مکر گئے
دم بھر کا تذکرہ ہے یہ آدھی گھڑی کی بات

ایفائے عہد چاہیے اب وہ بھی یاد ہے
جھوٹے کا قول، کمرے کا وعدہ، گلی کی بات

ہمیشہ خون دل روتا ہوں میں لیکن سلیقے سے
نہ قطرہ آستیں پر ہے نہ دھبہ جیب و دامن پر

تیغ نہ تھی، ادا تو تھی، نیتِ قتل کیوں پھری
میں نے یہ کب کہا کہ یوں، میں نے نہیں کہا کہ یوں

رفیق کرتے ہیں ایزاد کیوں تخلص پر
ہنر کو چھوڑ کے نسبت سے باوقار ہوں میں

ظہیر و ارشد و غالب کا ہوں جگر گوشہ
جناب داغ کا تلمیذ یادگار ہوں میں
امیر کرتے ہیں عزت مری، ہوں وہ سائل
گلوں کے پہلو میں رہتا ہوں ایسا خار ہوں میں

آہ کرتا ہوں تو آتے ہیں پسینے اُن کو
نالہ کرتا ہوں تو راتوں کو وہ ڈر جاتے ہیں
کھُل گئی شمع تری ساری کراماتِ جمال
دیکھ پروانے کدھر کھول کے پَر جاتے ہیں

تمھارے تیر کا پیکاں نہیں نکلا مرے دل سے
اسی میں چاہتے ہو نا اِدھر دیکھو اُدھر دیکھو

ایک گلشن میں ہے اِک خانۂ صیاد میں قید
گل و بلبل کو میسر نہیں یکجائی بھی

سنا ہے تیرے خیر مقدم کی عید
کہیں آج ہے، کل کہیں ہو چکی
مکرر گزارش پہ بولا وہ شوخ
نہیں کہہ دیا بس نہیں ہو چکی

اب دیر سے ہم سوئے حرم جائیں تو کیوں کر
اپنا ہے یہ مشرب جدھر آئے اُدھر آئے

بڑھ کر ہو کہیں حور سے، بہتر ہو پری سے
سیرت اگر اچھی ہو تو اچھے ہو سبھی سے

رہین منتِ ہر پیرِ میخانہ ہوا سائل　　پھر ایا ذوقِ میخواری نے اس کو در بدر کیا کیا

وہ تم سے کم نہ تم فلکِ فتنہ ساز سے　　نکلے ہوئے ہو دونوں حدِ امتیاز سے

ذرا سی مے پہ بگڑی تھی نہ ہوتا میں تو بڑھ جاتی　　اِدھر ساقی کو سمجھایا اُدھر سائل کو سمجھایا

ساقیِ تنگ ظرف ایک ہی جام　　وہ بھی اترا ہوا کناروں سے

چھینٹے سے جس کے دامنِ تر پاک و صاف ہو　　ایسی شراب کا میں طلب گار جام ہوں

سنا بھی کبھی ماجرا دردِ غم کا کسی دل جلے کی زبانی کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی کہو تو
تمھیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی کہو تو
بلائے کوئی ساقیِ حور پیکر مصفّا کشیدہ پرانی کہو تو
وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمھارے اشارے پہ قربان کر دوں ابھی مایۂ زندگانی کہو تو
مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں ہو جاؤں خدمت میں ابھی خود بتانے کو اس کے معانی کہو تو

تجھے نواب بھی کہتے ہیں شاعر بھی سمجھتے ہیں　　زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے جو دیکھ لے اس کو بتا کوئی کہاں دیکھے　　زمیں کی تہ میں ڈھونڈے یا فرازِ آسماں دیکھے
یہی خط اس کے منہ پر مار دیجو بیدھڑک قاصد　　اگر تجھ کو کڑی نظروں سے اس کا پاسباں دیکھے

کلام و اسم سائل کو ہر اک مہمل بتادے گا　　　اگر لکھا ہوا کاغذ پہ کوئی نکتہ داں دیکھے

دل و دیدہ نے یہ غضب ڈھا رکھا ہے مرے سر پہ کوہ الم دھر دیا ہے
غم عشق کا جال ایسا پڑا ہے کہ جینا مجھے تلخ تر کر دیا ہے
نہ میرا گنہ ہے نہ تیری خطا ہے زمانے نے مشہور کب کر دیا ہے
مرے دل نے دیوانہ مجھ کو کیا ہے، تجھے حسن نے نام دلبر دیا ہے
نوازا تجھے حسن نے تیرے ایسا کہ ہونٹوں کو لعل یمن سے بڑھایا
مرے عشق نے مجھ کو بخشی یہ "مایا" کہ دامن دُر اشک سے بھر دیا ہے
بہار آ کے کرنے لگی سب کو خرم پلانے لگی بادہ رندوں کو پیہم
بیاباں میں مخمل سے سبزہ نہیں کم چمن کو نہال گل تر کر دیا ہے
پیامی نے آکر یہ مژدہ سنایا کہ ہشیار ہو، ہے وہ آئے میں آیا
کہا میں نے پہلا سا پھر دھوکا کھایا، کہا قول دے کر مکرر دیا ہے
ہے سائل خود از اہل بذل و کرامت خدا نے اسے دی ہے دنیا کی دولت
جو مسکین لے کر کم و بیش حاجت جب آیا، اسے مٹھیوں زر دیا ہے

جفا کو لطف سمجھو جور کو اس کے کرم جانو　　　جو رکھے رابطہ بیداد گر وہ مغتنم جانو
غم دوری ہو ظاہر میں تو باطن میں کرم جانو　　　تصور کی بدولت دل کو دلبر سے بہم جانو
بتوں پر مرتے پھرتے ہو، مسلمانی کا دعویٰ ہے　　　خدا کا گھر نہ سمجھو دل کو تم بیت الصنم جانو
یہ پس خوردہ ہے پیر میکدہ کا شیخ کا وہ ہے　　　تبرک اک کو سمجھو، دوسرے کو محترم جانو
یہ کیا کم ہوش کھوتا ہے غم دنیا بھلاتا ہے　　　تم اپنے ساغر گل کو فزوں از جام جم جانو
نوائے بلبل گلشن سے ملتی ہے صدا اس کی　　　گدا سمجھو نہ سائل کو اسے اہل کرم جانو

تو کیسے جائے گا کب تک دل مضطر فریاد　　　تیری فریاد کی ہونے لگی گھر گھر فریاد

مدعا یہ ہے شب و روز ستم سے ان کا — رات بھر نالہ کیے جاؤں میں دن بھر فریاد
کون کرتا ہے انھیں حسن پرستوں میں شمار — حفظ نالہ نہ جنھیں ہو نہ ہو ازبر فریاد
پیرِ میخانہ ہی سائل کا خبر گیر ہو جب — بھوک سے پیاس سے پھر کیوں کرے دردر فریاد

حقیقت میں وہ دلبر و دل ستاں ہے، جسے چاہے خلقِ جہاں بے تکلف
مگر ایسا دلدار کوئی کہاں ہے، کہیں جس کو حورِ جناں بے تکلف
تکلف کی ہر شے خرابات میں ہے، مگر خود ہے پیرِ مغاں بے تکلف
نرالا اپنا بات میں، ذات میں ہے، مکاں پُر تکلف، دوکاں بے تکلف
جماعت کوئی ایسی ہم کو بتا دو جو رندوں سے پاکیزہ باطن کو دیکھو
اِدھر سے اُدھر تک جہاں چھان ڈالو مگر یار ایسے کہاں بے تکلف
ہوس میں نظارے کے سائل گیا ہے نہ معلوم کیا اس کو سودا ہوا ہے
دریا پر جانے کا یہ مزا ہے کہ دے گالیاں پاسباں بے تکلف

دلِ ناکام کو امید کرم ہے تو سہی — دیکھنے کو سوئے در آنکھوں میں دم ہے تو سہی
تیر کی نوک سے کہتے ہیں گلا کاٹیں گے — یہ بھی اِک نوع سے تکوین ستم ہے تو سہی
آنکھ میں سرمہ، شکن ماتھے پہ، خم ابرو میں — جانستانی کا یہ سامان بہم ہے تو سہی
ہو پرستار کو کیا تیرے تمنائے بہشت — حور پیکر ترا گھر رشکِ ارم ہے تو سہی
حیلہ جو، دشمن اربابِ وفا، عاشق کش — خط میں پورا ترا القاب رقم ہے تو سہی
رشتۂ الفت کا بہت دن ہوئے ٹوٹے لیکن — اب بھی کچھ کچھ اثرِ یادِ صنم ہے تو سہی
نسبتِ داغ سے دلّی کی زباں سے سائل — شاعری کا تری دنیا میں بھرم ہے تو سہی

باغ میں دیکھ کے اکثر گلِ تر کی صورت — یاد آجاتی ہے اس رشکِ قمر کی صورت
ایک حیراں اثرِ حسن سے اِک ہے مضطر — دل کی صورت سے جدا ہو گی جگر کی صورت

نعت

زباں پر نام پاکِ خسروِ دنیا و دیں آیا
کہو صل علیٰ مذکورِ ختم المرسلیں آیا

کسی دن غلغلہ، رحمۃ للعالمیں آیا
کسی دن دھوم یہ ہو گی، شفیع المذنبیں آیا

عوض دادِ سخن کے وردِ ہو صلوات کا ہدیہ
تو میں سمجھوں تمھیں اس کے فضائل کا یقیں آیا

سحر معراج کی ہے اور یہ اہلِ جذب کی باتیں
بڑی مدت میں شب کو لامکاں کا سیر بیں آیا

ازل میں حق نے سونپی تھی امانت دین کی جس کو
بنی ہاشم کے گھر میں اس امانت کا امیں آیا

عبادت سے ملی معجز نما اس کی ولادت تھی
کہ مشیِ حق وہ ماں کے پیٹ سے ٹیکے جبیں آیا

فرشتوں نے مبارکباد کا ہدیہ دیا اُوس کو
جب آغوشِ حلیمہ میں خدیوِ مسلمیں آیا

ولادت پر شہِ دین کی یہ مجذوبوں میں چرچا تھا
سپر مہ کی جو چیرے گا وہ سالارِ مہیں آیا

حزف ہو جائے جس کے سامنے خاتم سلیماں کی
پئے انگشترِ دنیائے دیں ایسا نگیں آیا

کمالِ دینِ ابراہیم لایا بطنِ مادر سے
جمالِ یوسفِ کنعاں کا غیرت دہِ حسیں آیا

خدا سے التجا جو ہو اسی کے واسطے سے ہو
دعاؤں کا سہارا آرزوؤں کا معیں آیا

درود اس پر ہو جس پر صحیفہ ہو گیا نازل
جو لے کر نصِ اتممت لکم دین مبیں آیا

خدا مخلوق سے اقرب، مگر جز سرورِ عالم
کوئی مخلوق عالم سے بھی خالق کے قریں آیا

تصور میں عطائے مصطفےٰ روزِ قیامت ہے
فرشتہ اک، مئے کوثر کا لے کر ساتگیں آیا

وہی ہے بایاں باز دخواب گاہ جاودانی کا
جو ملنے اس مجسم خلق سے چیں بر جبیں آیا

تمنا ہے کہ ہو اس سرزمیں پر مدفن سائل
جہاں پیغام دعوت کا لیے روح الامیں آیا

غیر سے روٹھے رہے تکرار ہو کر رہ گئی
کروٹیں قسمت نے لیں بیدار ہو کر رہ گئی[1]

فیض یابِ زخم دامن دار ہو کر رہ گئی
یعنی پھولوں کی چھڑی تلوار ہو کر رہ گئی

اپنے کوچے میں اٹھایا حشرِ عالم چھوڑ کر
دو قدم ہی شوخیِ رفتار ہو کر رہ گئی

جس جگہ تھے داغ، جس جا زخم تھے، ناسور تھے
حسرتِ دل بھی وہاں آزار ہو کر رہ گئی

قتل کی نیت میں قاتل کس لئے آیا خلل
یہ بنا دے کیوں طلب تلوار ہو کر رہ گئی

غیر کی گردن میں کافر کیش کی باہیں پڑیں
کیا اجل اس کے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

پہلے تھی بجلی کی جاتی اب لہو کی آب سے
نام زد تیغِ ستم گل نار ہو کر رہ گئی

آج واعظ نے فقط ذکر قیامت ہی کیا
تیری طرحِ شوخیِ رفتار ہو کر رہ گئی

شرم آتی ہے یہ سن کر دل بتوں کو دے دیا
یوں کہو دل پر خدا کی مار ہو کر رہ گئی

میکشو کیوں ہجو مے پر شیخ کی پگڑی نہ لی
جاؤ بھی تم سے ہمارے یار ہو کر رہ گئی

جھٹپٹا ہوتے ہی قاصد کہہ گیا فرصت نہیں
عیش کی شب میری شام تار ہو کر رہ گئی

ابن عمراں کا فسانہ سن کے جی سا چھٹ گیا
دل میں پیدا حسرتِ دیدار ہو کر رہ گئی

آپ فرماتے تھے اب سے ہم کریں گے دیکھ بھال
دل دہیِ خاطرِ بیمار ہو کر رہ گئی

قید طاعت کی علامت کا فرو دین دار ہیں
سبحہ بن کر رہ گئی زنار ہو کر رہ گئی

تا قیامت فتنے اٹھیں گے ترے کوچے سے روز
ہو گئی اور شوخیِ رفتار ہو کر رہ گئی

جورِ گلچیں سے اڑے بلبل کے اس درجہ حواس
شاخِ گل پر نقش بر دیوار ہو کر رہ گئی

اُن کے تیور دیکھ کر سائل کیا ہوتا سوال
بات اتنی اس قدر دشوار ہو کر رہ گئی

بے بہا ہوتے ہیں عشاق کی آنکھوں کے سرشک
دیکھنے میں نظر آتے ہیں گہر کی صورت

نام سائل ہے مگر چشم طمع سے اُس نے
کبھی دیکھی ہی نہیں صاحب زر کی صورت

---

[1] مطبوعہ پارہ کجکول، ص ۱۶

مرزا حسین علی خاں شاداں

نواب زین العابدین خاں عارف کے چھوٹے صاحبزادے اور مرزا غالب کے بے حد لاڈلے پوتے تھے۔ عارف کا انتقال ہوا تو شاداں صرف دو سال کے تھے۔ ماں کا انتقال اس سے بھی قبل ہو چکا تھا۔ اس لیے امراؤ بیگم نے اس بن ماں باپ کے بچے کو اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا۔ بڑی غمزدہ بہن بنیادی بیگم بھلا کیسے دو دو لاڈلے بچوں کو سنبھالتیں۔ بڑا باقر علی خاں جو ان سے بہت مانوس تھا ان کے پاس رہا، چھوٹے کو امراؤ بیگم لے آئیں۔ یہ شوخ چنچل بچہ غالب کی زندگی بن گیا۔ عارف کو مرزا نے اپنے اندھیرے گھر کے لیے اجالا سمجھا تھا، مگر وہ جان ہار جب نہ رہا تو غمزدہ بوڑھے شاعر کے لیے یہ کمسن بچہ ہی دل بہلانے کا آسرا بن گیا۔

شاداں کے ناز جس جس طرح مرزا صاحب اٹھاتے تھے اگر اس کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے۔ حسین علی خاں کو غالب کی بیجا نازبرداری نے بالکل غیر ذمہ دار بنا دیا تھا۔ خواہ گھر میں کچھ حالت ہو، بوڑھے دادا پر قرضے کا کتنا ہی بار ہو حسین علی خاں کے سیر سپاٹے اور مشاغل میں فرق نہیں آتا تھا۔ اگر کبھی ذرا سی دیر بھی روپے دینے میں مرزا صاحب حسین علی کو کرتے تھے تو وہ ان کا ناک میں دم کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مرزا صاحب نے تنگ دست ہونے کے باعث شاداں کو پھول والوں کی سیر میں جانے کے لیے خرچ نہیں دیا تو شاداں نے چاندی کا فتیل سوز اٹھا کر فروخت کر دیا اور پھول والوں کی سیر میں چل دیئے۔ اس واقعہ کی خبر

داروغہ کلو نے نواب ضیاء الدین احمد خاں کو دی۔ وہ مرزا صاحب کے پاس آئے اور کہا "آپ نے لڑکے کو بیجا لاڈ کر کے بالکل بگاڑ دیا ہے۔ اب اس کی جرأت اتنی بڑھ گئی ہے کہ گھر کا سامان فروخت کر کے سیر تماشوں میں جانے لگا"۔ مرزا صاحب شاداں کی شوخیوں سے کافی بیزار ہو رہے تھے اس لیے کہنے لگے "ہاں بھئی تم ٹھیک کہتے ہو، اگر یہی حال رہا تو حسین ایک دن مجھے بھی فروخت کر دے گا۔ تم اس کو اب اپنے پاس رکھو"۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں حسین علی خاں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مرزا صاحب نے شاداں کو بھیج تو دیا تھا، مگر دل اس شوخ ہی میں ان کا اٹکا ہوا تھا۔ شام ہوتے ہی داروغہ کلو سے کہا "نہ جانے حسین نے کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں"۔ داروغہ کلو نے طنزیہ انداز سے کہا "ہاں، نواب صاحب کے یہاں کھانا کہاں ملا ہو گا، یوں فرمایئے نا، کہ آپ کو یہ سکون اور چین پسند نہیں۔ وہ شریر لڑکا اندر باہر جو اپنی شوخیوں سے طوفان اٹھائے رکھتا ہے یاد آرہا ہے"۔ مرزا صاحب وفادار ملازم کی یہ طنز آمیز گفتگو سن کر خاموش ہو گئے، مگر رات بھر ان کو اپنے پیارے حسین کے خیال میں نیند نہ آئی، شاداں کی پلنگڑی خالی نظر آتی تو ان کا دل بھر آتا تھا۔

عارف کی بے وقت موت نے جوان کے دل پر کاری زخم لگایا تھا۔ اس پر شاداں کا وجود مرہم بن گیا تھا۔ صبح اٹھ کر انھوں نے داروغہ کلو سے کہا "تم حسین کو لے آؤ، میں ناشتہ اس کے ساتھ ہی کروں گا"۔

داروغہ کلو بڑبڑاتے ہوئے گئے اور شاداں کو لے آئے۔ مرزا صاحب کو چین جب ہی ملا جب یہ نونہال ان کے گلے سے پھر آلگا۔ چونکہ شاداں نے غالب کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے رہے، اس لیے بہت کمسنی سے شعر کہنے لگے تھے۔ فارسی اردو دونوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ شروع میں تخلص راقم تھا بعد میں شاداں رکھا۔

۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامے کے بعد دلی میں ایک معرکے کا مشاعرہ ہوا تھا۔ اس وقت شاداں کی عمر نو یا دس سال کی تھی۔ اس مشاعرے کا ایک مجموعہ 'فغانِ دہلی' کے نام سے اکمل المطابع سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں شاداں کا ایک شعر بھی شامل ہے۔ مشاعرے میں دلی کی تباہی اور یہاں والوں کی بربادی پر سب شعرا آنسو بہا رہے تھے۔ سب کو بچھڑے

ہوئے عزیزوں اور دوستوں کی یاد رُلا رہی تھی۔ مشاعرے میں ہر جانب سرد آہیں تھیں، دل غمگین تھے اور چہرے اداس — اس بزمِ یاس و حسرت میں ہر شاعر غم کی تصویر بنا بیٹھا۔ اس عالم میں یہ کمسن بچہ شعر پڑھنے کھڑا ہوا۔ سب کی نظریں اس کی جانب لگ گئیں کہ دیکھیں غالبؔ کی گود کا پلا کیا کہتا ہے۔ اس گھور اندھیرے میں شاداںؔ کا شعر امید کی کرن بن گیا۔ انھوں نے خوش آہنگ لہجے میں کہا:

مٹ گیا خوب ہوا، نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

گویا رونے والوں پر اس شعر میں طنز کیا کہ اب ماضی کو بھول کر مستقبل بنانے کا فکر کرو، شاداںؔ زندگی بھر لاابالی مزاج رہے۔ مرزا صاحب کے انتقال کے بعد رام پور کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار یہاں سے ان کو ملتے تھے۔ شادی شاداںؔ کی خاندان ہی میں ہوئی تھی اولاد نہیں ہوئی۔ بڑے بھائی مرزا باقر علی خاں حسین علی خاں کا مرتے دم تک خیال کرتے رہے، باقر علی خاں کی جوانمرگی سے حسین علی خاں کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ نازبردار بڑے بھائی کا غم ایسا کیا کہ ان کے تین سال بعد ہی عین عالم شباب میں ۲۹ سال کی عمر میں ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۹۷ھ کو انتقال کیا۔

نساخؔ نے تاریخ کہی:

برفت آہ شاداں ز دنیائے دوں	خدایا مقامش بہ فردوس باد
برائے سنِ رحلتش خامہ ام	رقم کرد "شاداں فرخ نہاد"

۱۲۹۶ھ

سلطان جی حضرت محبوب الٰہی کی پائینتی اپنی خاندانی ہر واڑ میں بڑے بھائی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ افسوس شاداںؔ کی عمر نے وفا نہ کی اور دماغ بہک گیا۔ ورنہ ان سے خاندان لوہارو اور مرزا صاحب کا نام روشن ہوتا۔ کاش وہ کچھ اور زندہ رہتے۔ شاداںؔ کی شاعری کے نمایاں وصف محاورہ، روزمرہ، شوخی و شگفتگی ہیں۔

شاداںؔ نے غالب سے اپنے کلام پر پہلے اصلاح لی، ان کے بعد حالیؔ اور سالکؔ

سے مشورہ کیا۔ ان کا مختصر مجموعہ کلام رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، پہلے غالب کے رنگ کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے:

تری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا　　مجھے موت و زندگی پر اگر اختیار ہوتا
میری خاک ہو تسلی تیرے وعدۂ غلط پر　　تجھے گر ہنسی نہ آتی مجھے اعتبار ہوتا

عالم نہ مجھ سے پوچھئے، میرے خیال کا　　آئینہ بن گیا ہوں کسی کے جمال کا
بھڑکے اگر چراغ تو ہستی تمام ہو　　ہر چیز کا کمال ہے باعث زوال کا

تم تو آتے ہی رہے بہرِ عیادت اور ہم　　مر گئے چارۂ آزارِ جگر ہونے تک
دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع بہتر ہے ان سے　　رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہونے تک

پہلو میں میرے اور یہ پیدا ہوا رقیب　　آثارِ عشق رخ پہ میرے رازداں کے ہیں
شاداں چھپائے لاکھ یہ چھپتے بھی ہیں کہیں　　آثار اُن کے چہرے پہ عشقِ بتاں کے ہیں

شرماتے ہو کہ نیند کا آنکھوں میں ہے خمار　　کل کی سی بات ہی نہیں طرزِ نگاہ میں

ہو چکی شیشے میں مے مجھ تک جو آیا دورِ جام　　گردشِ قسمت تھی اپنی گردشِ ساغر کے ساتھ

اٹھ کر درِ جاناں سے کہو کوئی کدھر جائے　　جی سے نہ گزر جائے تو دنیا سے گزر جائے
ساغر کشِ میخانۂ توحید ہوں، ناصح　　وہ نشہ نہیں مجھ کو جو باتوں سے اتر جائے
رنجور یہ الفت کا مری پوچھ نہ انجام　　آغاز میں وہ درد ہے جو حد سے گزر جائے

میں اپنی داستانِ محبت جو کہہ چکا　　وہ پوچھتے ہیں مجھ سے یہ قصے کہاں کے ہیں

کس جائے ہوا میرے تصور کا گزر آج — آتی نہیں جو اپنی حقیقت بھی نظر آج
وہ دیکھنے آتے ہیں میرے حالِ زبوں کو — اچھا ہے جو بڑھ جائے میرا دردِ جگر آج

شبِ ہجراں میں جو تڑپا میں سحر ہونے تک — مل گیا خاک میں اس بت کو خبر ہونے تک

شبِ غم کی مصیبت کا بیاں ہے — ہماری ختم کیوں کر داستاں ہو

آفت کا توڑ ہے تیرے تیرِ نگاہ میں — پیدا اثر کہاں سے ہو عاشق کی آہ میں
اور جفائے تازہ کی آتی ہے چرخ سے — جاتا ہے میرا نالہ تو رکتا ہے راہ میں

وہ نازکی سے تصور میں آ نہیں سکتے — جو آ گئے تو میرے دل سے جا نہیں سکتے

بیخودی میں ہے تجسس مجھے اپنا لیکن — اک قدم بھی نہیں پڑتا سوئے منزل میرا
ناز کرنا جو ذرا اس پہ سمجھ کر کرنا — آپ کی طبع سے نازک ہے سوا دل میرا

مضبوط ہو کے ٹوٹ گیا رشتۂ حیات — وہ شوخ وعدہ کر کے جو پیماں شکن ہوا

حسین علی خاں کو مرنے سے دو سال قبل یہ وہم ہو گیا تھا کہ شاعر کو کاہیدہ جسم ہونا چاہئے۔ اکثر دو دو وقت کھانا نہیں کھاتے تھے اور پانی بھی کم پیتے تھے۔ بعض اوقات سیپ میں پیتے تھے۔ اس وہم نے ان کے چھریرے جسم کو نحیف و نزار کر دیا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ ضعف کی وجہ سے آخر میں اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ اکثر تمام تمام دن خاموش لیٹے رہتے اور اُن کا یہ شعر شاعری میں ان کی حقیقت تھا:

یہ شدت ناتوانی کی، یہ عادت ہے خموشی کی
کہ دم لیتا ہوا آتا ہے لب تک ہر سخن میرا

درد و غم سارے جہاں کے اس میں جمع ہیں — سینۂ عاشق نہ ٹھہرا خانۂ ماتم ہوا
جب ہوئی حد سے فزوں تکلیف راحت ہو گی — درد اتنا بڑھ گیا میرا کہ گویا فن ہوا

پڑھ کے میری داستانِ شوق قاصد سے کہا — خامشی سے بڑھ کے کیا دوں ایسے دفتر کا جواب

مژدۂ وصل ہی لانا ہو اگرچہ قاصد — کیا بچوں گا تیرے آنے کی خبر ہونے تک

ایک وہ ہیں کہ جو دل چاہے وہ کہتے ہیں مجھے — ایک میں ہوں کہ نہیں تابِ تکلم مجھ کو

گر رازِ عشق ہے تو چھپایا نہ جائے گا — کیوں کر کہوں کہ حال سنایا نہ جائے گا
جانا عدم کو سہل ہے اس کی تلاش میں — لیکن یہ خوف ہے کہ پھر آیا نہ جائے گا
ہے رنگِ عشق رخ سے عیاں دیکھ لیجئے — یہ دردِ دل نہیں کہ سنایا نہ جائے گا
آیا ہوں در پہ دور سے در تک تو آؤ تم — کیا دو قدم بھی آپ سے آیا نہ جائے گا
قاصد کے آتے آتے ہم اتنے ہوئے ضعیف — اِک حرف اس کے خط کا اٹھایا نہ جائے گا
شاداںؔ نے دل لگا کے بتوں سے برا کیا — اس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

فارسی میں بھی شاداںؔ نے کافی کہا ہے مگر ان کا فارسی کلام کہیں سے ملا نہیں۔ فارسی میں وہ خیالؔ تخلص کرتے تھے۔ تذکرۂ انتخاب یادگار سے پانچ شعر پہلے دو غزل کے اور آخری دو قصیدوں میں سے جو خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہے گئے تھے مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالبؔ میں دیئے ہیں:

آغوش گو اتنگ شد از بے قراریم — اے دل از پہلوئے کہ جدا گشتہ ایم ما

شرم می آید خیالؔ را بجنگِ آسماں — کایں جوانے ہست داد یک پیرِ دیریں سالہ است

چہ احتیاجِ نگہباں، بہ عہدِ دولت او		کہ پاسبانِ جہان است طالع بیدار
اگر غلط نکنم ناوکش خطا نکند		رہا کند سوئے عنقا اگر بہ عزمِ شکار

غم نیز در خوشی ست کہ فارغ شدہ زکار		بر جائے خود بہ بسترِ خواب آرمیدہ است
(از تلامذۂ غالب صفحہ ۱۴۰)

نواب سعید الدین احمد خاں طاؔلب

مرزا سعید الدین احمد خاں طاؔلب نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے چھوٹے بیٹے اور نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ رستم جنگ کے پوتے ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت اسی اعلیٰ پیمانے پر ہوئی جیسی اس زمانے کے امیر زادوں کی ہوتی تھی۔ بہت خوش رو، جامہ زیب اور طرح دار انسان تھے، ورزش، فنونِ سپہ گری کا دلی شوق تھا۔ ذوقِ شعر و ادب بھی باپ سے ترکے میں پایا تھا۔ بارہ یا چودہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ پہلے اپنا کلام بڑے بھائی مرزا شہاب الدین خاں ثاقبؔ کو دکھایا پھر سالکؔ سے اصلاح لی۔ مرزا غالبؔ کی آغوشِ محبت میں پلے تھے۔ جو کچھ کہتے، بعد اصلاح ان کی نظر فیض اثر سے بھی گزرتا تھا چنانچہ فرماتے ہیں:

یہ سب کچھ ہے طفیل حضرتِ غالبؔ وگرنہ ہم میں طاؔلب خاک طاقت ہے

ایک مقطع میں اپنے والد گرامی قدر کی طرف اشارہ کیا ہے:

حضرت نیرؔ کا سکہ ہے جہاں میں چل رہا ہے سخن کی مملکت طاؔلب یہاں جاگیر میں

سالکؔ و مجروحؔ سے نواب طاؔلب نے اوائل عمری میں اصلاح لی۔ سالکؔ حیدر آباد اور مجروحؔ الور چلے گئے تو مولانا حالیؔ سے طاؔلب اصلاح لینے لگے۔ ان کا زیادہ کلام مولانا حالیؔ

کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب طالب بڑے اچھے شہسوار تھے۔ گھوڑے کو سر بازار الف کر کے پچھلی ٹانگوں سے چلانا ان کا روزانہ کا مشغلہ تھا۔ ان کے اصطبل میں بہترین نسل کے عمدہ گھوڑے ہمیشہ رہتے تھے۔

دلی میں اس زمانے میں نواب مرزا سعید الدین احمد خاں طالب کو یوسف ثانی کہا جاتا تھا۔ تھے وہ واقعی اس قابل۔ سفید شبنم کے کرتے سے ان کا گورا بدن ایسا جھلکتا تھا جیسے بلوری کنٹر میں بادۂ ناب چھلک رہا ہو۔ دلی والے ہر شام کو اس بہادر اور خوب رو انسان کو دیکھنے کے منتظر رہتے تھے۔ حسن صورت کے ساتھ حسن گفتار کی بدولت جہاں وہ جاتے جانِ محفل بن جاتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں لفٹننٹ گورنر پنجاب اجرٹن نے نواب طالب کو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کر دیا۔ دس سال تک بہت خوش اسلوبی سے انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو انجام دیا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں ان کی اس ملازمت سے مرتے دم تک رنجیدہ رہے ان کی شانِ امارت کے یہ بات خلاف تھی۔ بھلا کسی خاندانی رئیس کو اللہ کا دیا سب کچھ ہوتے ہوئے ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

نواب نیر رخشاں کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہو گیا۔ طالب نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور دلی آکر اپنی جائداد کا انتظام سنبھالا۔ کچھ عرصے بعد دلی کمیٹی کے ممبر نامزد ہو گئے خاندانِ لوہارو نسبی لحاظ سے علوی ہے۔ حضرت علیؓ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمد بن حنفیہ سے اس خاندان کا سلسلۂ نسب جا کر ملتا ہے۔ طالب نے اپنے تصنیف کئے ہوئے مرثیے کے ٹیپ کے بند میں اِس طرف اشارہ کیا ہے؛

المختصر کہ خادمِ شاہ نجف ہیں ہم
مشکل کشا ہیں جن کے سلف وہ خلف ہیں ہم

چند سال تک نواب طالب نے بہت اہتمام سے محرم کے دس دن تک تعزیہ داری کی۔[1]

---

[1] لوہارو والے علوی ہونے کے باعث اہل بیت سے بہت عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔ کچھ مرزا غالب کا اثر بھی ان لوہر ہے جب تک ریاست قائم رہی۔ تیرہ دن مجلسیں ریاست لوہارو میں بڑے اہتمام سے ہوتی تھیں۔ ایک گاؤں ریاست کی جانب سے نذر نیاز کے لئے وقف تھا۔ اور ایک مہتمم نیاز کا اہتمام کرنے کے لئے۔

دلی میں ان کے یہاں کی مجلسوں کی بہت شہرت تھی۔ لکھنؤ سے مشہور خواں بلائے جاتے تھے۔ اور خود طالبؔ بھی اپنا کہا ہوا مرثیہ پڑھتے تھے۔ کیونکہ فارسی نواب طالبؔ کے لئے بمنزلۂ مادری زبان کے تھی۔ اس لئے کبھی کبھی فارسی ترکیبیں بھی وہ استعمال کرتے تھے لیکن اکثر کلام ان کا دلی کی شستہ ورفتہ زبان میں ہے۔ روزمرّہ اور فصاحت ان کے کلام کی امتیازی شان ہے۔ افسوس ہے ان کا دیوان بھی شائع نہ ہوسکا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ لوہارو میں تھا وہ رضا لائبریری لوہارو سیکشن رام پور میں ہے۔ شعر پڑھنے کا انداز بہت دل آویز تھا۔ نواب طالبؔ کا انتقال یکم ستمبر ۱۹۲۰ء کو یکایک حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ہوا۔ اولاد کوئی نہیں چھوڑی۔ اور اپنی ذاتی کوٹھی میں اپنے والد کی پائینتی قطب صاحب میں دفن ہوئے۔[۱]

طالبؔ کی شادی خاندان سے باہر بادشاہ بیگم دختر آغا سید احمد شاہ نواب سردھنہ سے اپریل ۱۸۷۳ء میں ہوئی تھی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

بہار آئی یہ سن کر یوں ہوئی محوِ طرب بلبل   کہ ہر کنجِ قفس اس کی نظر میں اک گلستاں تھا

---

[۱] مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں یہ غلطی سے لکھ دیا "طالب اپنے چچا نواب علاؤالدین احمد خاں کی ہرواڑ میں باپ کے پہلو میں دفن کئے گئے" (ص ۲۵۳) اول تو یہ غلط ہے، علائی ان کے چچا نہیں چچازاد بھائی تھے اور طالب کا مدفن باپ کے پہلو میں نہیں باپ کی پائینتی ہے۔ کوٹھی مرزا بابر والی بہادر شاہ ظفر کے بھائی مرزا بابر کی کوٹھی تھی، جو ۱۸۶۸ء میں اورشاہی جائداد کے ساتھ نیلام کی گئی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے یہ کوٹھی خریدی تھی۔ ان کے بعد یہ نواب طالب کی ملکیت رہی۔ اس کا درگاہ سے ملا ہوا حصہ جو صندل خانہ کہلاتا ہے۔ اِس کے درگاہ کی جانب والے دالان میں نواب امین الدین احمد خاں، نواب علائی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں آسودۂ خواب ہیں۔ طالب، تاباں، سائل اس کے صحن میں دفن ہیں۔

یہ کوٹھی نواب طالبؔ کے بعد ان کی ہمشیرہ معظم زمانی بیگم کو ترکے میں ملی۔ اُن کا مدفن بھی یہیں ہے۔ ماں کے بعد تینوں صاحبزادیوں محمد سلطان بیگم، فاطمہ سلطان بیگم، رقیہ سلطان بیگم نے یہ خاندانی ورثہ پایا۔

اس سے ستم کی کوئی وجہ پوچھتا نہیں　　پرساں ہے اک زمانہ ہمارے ہی حال پر

طالب کی لو خبر کہ وہ بیمار ناتواں　　دنیا میں کوئی دم کے لیے میہماں ہے اب

محتسب نے خوب پی پیرِ مغاں کے ہاتھ سے　　راہ پر آیا جو پہنچا مرشدِ کامل کے پاس

ساقیا ہے بزم آخر، دور بھی ہے آخری　　دیکھنا محروم رہ جائیں نہ اک ساغر سے ہم

اس کے در سے اٹھے اٹھائے ہوئے　　ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

اٹھایا جو رخ سے بزم میں اس نے نقاب کو　　شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو

اپنے بیگانے ہوتے سب لطفِ ساقی دیکھ کر　　پھر گیا ہم سے زمانہ گردشِ ساغر کے ساتھ

مگر چل گیا وار تیرِ نگہ کا　　خلش دل میں ہے اور پیکاں نہیں ہے

ترے ساتھ تھے دل کے ارمان سارے　　نہیں جب سے تو، کوئی ارماں نہیں ہے

نہیں اس میں گنجائشِ کینِ دشمن　　وہ دل جس میں تیری محبت بھری ہے
نہیں فکر کچھ، ہم جو بیٹھے ہیں، حالی　　صراحی تو مے کی لبالب بھری ہے

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے　　زمانے کو کیوں کر نئی سوجھتی ہے
قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو　　تمھیں زاہدو! دور کی سوجھتی ہے

یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی وہ سمجھے کہ اِس کو خوشی سوجھی ہے

ہیں دل فریبِ نقش ونگارِ جہاں، ولے کیا اس کا اعتبار ہے جو مستعار ہے

نواب طالب کی ایک غزل اب نئی بحر میں ملاحظہ کیجیے۔
یہ غزل رسالہ کمال دہلی، جون ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی۔

یہ کہہ کر بحرِ الفت میں قدم ڈالا کہ بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا
ہو اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کیوں کر اگر ہر رونگٹے پر ہو زباں پیدا
دلِ بےتاب بولا جب چھٹی زلفیں تمہارے رخ پہ واللیل اذا یغشیٰ
کلیم اللہ بنا ہو، سوزِ الفت سے سویدائے دل اپنا ہے یدِ بیضا
مٹایا صرصرِ فرقت کے جھونکے نے ہماری زندگی بھی تھی حباب آسا
بچے کیوں کر وہ کشتی جو شکستہ ہو جہاں طوفاں ہو اور ساحل ہو ناپیدا
اکٹھے دل میں یوں غم ہوتے جاتے ہیں کہ جیسے جمع ہوتے ہیں کفِ دریا
شفیع اپنے بنیں گے حشر میں طالب محمدؐ اور علیؓ اور فاطمہؓ زہرا

دوسری غزل ہے:

کیا کہیں باغِ جہاں میں کیا سے کیا کیا ہو گیا خارِ صحرا گل ہوا اور پھول کانٹا ہو گیا
شربتِ دیدار لکھا تھا مسیحا نے فقط دیکھ کر نسخہ مریضِ عشق اچھا ہو گیا
دیکھنا بادِ بہاری کی ذرا اٹھکھیلیاں گل سے بلبل کا چمن میں آج کانٹا ہو گیا
بزمِ جاناں میں ہوئے اغیار سارے منفعل بس دمِ تقریر اپنا بول بالا ہو گیا
پہلے ایسے وہ کہاں تھے محبتِ ناجنس سے رات دن کی دل لگی اب ڈھول دھپّا ہو گیا
شرمِ عصیاں سے ہوا اشکِ ندامت میں جو غرق رُخ پہ جو آنسو بہا رحمت کا چھینٹا ہو گیا
اب کہاں جوشِ جوانی اور کہاں وہ رنگ روپ سب یہی کہتے ہیں طالب پان پکا ہو گیا

میر مہدی مجروح کی تاریخِ وفات کہی۔ ان کا کہا ہوا قطعہ لوحِ مزار پر کندہ ہے:

یادگارِ غالب معجز بیاں — میر مہدی سیدِ والا تبار
بُد کلامش سر بسر آہ و فغاں — چوں تخلص بود مجروحِ فگار
کرد از دنیا، چو آہنگِ سفر — گفت "اغفرلی الٰہی" چند بار
طالبا دیگر مرنجاں فکر را — رازِ خویش خود ز "اغفرلی" برار

اپنے والدِ محترم کی وفات پر بھی طالب نے فارسی میں قطعہ کہا ہے:

آنکہ در نظم سحر تاب ضیائی نیّر — آنکہ در نثر مَسا جلوۂ ماہ انور
آنکہ در لطف بیاں کوکبِ تیر و زاووش — آنکہ در حسن زباں زاورِ چرخِ اخضر
کیست آں اخترِ تابندۂ افلاک سخن — کیست آں شمسۂ محرابِ رواقِ اشعر
قبلہ ام حضرتِ نواب ضیاء الدین خاں — کہ بیاراست بالفاظ و معانی دفتر

بہرِ اطباع سنینِ نبوی اے طالب
ہاتفم گفت۔ خوش آہنگ کلامِ نیّر

۱۳ ۳۴ ھ

نواب زین العابدین خاں عارفؔ

عارفؔ کے مورثِ اعلیٰ بلخ سے ہندوستان آئے تھے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بخارا میں خواجہ عبدالرحمٰن لیسوی ایک عالی خاندان رئیس خواجہ احمد لیسوی کی اولاد میں تھے۔ اتفاقِ زمانہ سے وطن چھوڑ کر بلخ میں آئے اور یہیں خانہ دار ہوئے۔ خدا نے تین فرزندِ رشید عطا کئے۔ قاسم جان عارف جان، عالم جان ——— ان جوانوں کی ہمّت نے گھر میں بیٹھنا گوارا نہ کیا۔

ایک جمعیت سوار پیادہ ترکانِ ازبک کو لے کر ہندوستان آئے۔ پنجاب میں معین الملک عرف میر منّو خلف نواب قمرالدین خاں وزیر محمد شاہ حاکم تھے۔ ان رئیس زادوں کو اپنی رفاقت میں لیا۔ انھوں نے اپنی ہمت کے گھوڑے دوڑا کر پنجاب میں ناموری حاصل کی۔ تھوڑے عرصہ بعد میر منو کا انتقال ہوگیا اور ان لوگوں نے دربار کا رخ کیا۔ اس وقت شاہ عالم میرن کے مقابلے پر بنگال میں فوج لئے پڑے تھے۔ یہ بھی وہیں پہنچے۔ قاسم جان نے اپنی بہادری سے شاہ عالم کو خوش کر کے نواب شرف الدولہ، سہراب جنگ کا خطاب پایا اور ہفت ہزاری کا منصب ملا۔ بادشاہ کے ہمراہ تینوں بھائی دہلی آئے۔ اور یہیں سکونت اختیار کی۔ بلیماروں کے محلے میں قاسم جان کی گلی انہی قاسم جان سے منسوب ہے۔ اب بھی ان کے خاندان کے افراد اس گلی میں سکونت رکھتے ہیں۔

نواب قاسم جان تو اکثر لڑائیوں پر رہتے تھے۔ چھوٹے بھائی عارف جان دیہات اور

جاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا انتقال تھوڑے وقفے سے ہوا۔ شرف الدولہ سہراب جنگ نواب قاسم جان نے چار لڑکے چھوڑے، محمد بخش خاں، فیض اللہ بیگ خاں، قدرت اللہ بیگ خاں، نبی بخش خاں، محمد بخش خاں کاروبار ریاست سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے۔ اس لیے فیض اللہ بیگ خاں تھوڑے عرصے بعد رئیس ہو گئے اور باپ کا خطاب سہراب جنگ پایا۔ محمد بخش خاں کے صرف ایک صاحبزادے فتح اللہ بیگ خاں تھے۔ نواب فیض اللہ بیگ خاں کے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تین اولادیں تھیں۔ نواب غلام حسین خاں مسرور، نقشبند خاں اور انجم النساء بیگم ـــــ قدرت اللہ بیگ نے دو شادیاں کیں، پہلی بیوی سے چار صاحبزادیاں تھیں۔ دوسری بیوی سے ایک صاحبزادی حاجی بیگم اور دو صاحبزادے معین الدین حسن خاں اور محمد حسن خاں تھے۔ حاجی بیگم صاحبہ منسوب تھی، نواب ضیاء الدین احمد خاں خلف نواب احمد بخش خاں سے ـــــ نواب فیض اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد نواب غلام حسین خاں مسرور نے بدروی اختیار کی، اس لیے ریاست ہاتھ سے نکل گئی۔ نواب غلام حسین خاں اور نقشبند خاں کو ایک ایک ہزار ماہانہ تازیست ملتا رہا۔ نواب غلام حسین خاں کے دو صاحبزادے تھے۔ نواب زین العابدین خاں عارف اور نواب حیدر حسن خاں ـــــ نواب زین العابدین خاں عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی خورد سال ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی والدہ بنیادی بیگم صاحبہ نے ان کی پرورش اس زمانے کے دستور کے مطابق اعلیٰ پیمانے پر کی اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ نواب زین العابدین خاں عارف کو سرکار انگلشیہ سے ڈھائی سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں عارف کی شادی نواب بیگم بنت نواب احمد بخش خاں رئیس جھرکا فیروز پور سے ہوئی۔ شادی کے بعد ڈھائی سو روپے ماہانہ فیروز پور سے عارف کو تازیست ملتے رہے۔ نواب بیگم کا شادی کے دو سال بعد انتقال ہو گیا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں۔ عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا محمد علی بخارائی کی لڑکی سے ہوئی۔ دوسری بیوی کا نام بستی بیگم اور خطاب نواب دلہن تھا۔ ان سے دو لڑکے ہوئے۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ ان دونوں کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

عارف کے نام سے دنیائے ادب میں کون واقف نہیں، بھلا مرزا غالب کے چہیتے عارف کو کون نہیں جانتا چونکہ نواب غلام حسین خاں مسرور بہت رنگین مزاج، لاابالی طبیعت، رند،

وضع رئیس تھے۔ بیوی سے ساری عمر نہ بنی، امراؤ بیگم کے یہاں جب سات بچے ہو کر مر گئے تو بڑی بہن بنیادی بیگم نے عارف کو ان کو دے کر غم زدہ بہن کے آنسو پونچھے، عارف جوان، صالح اور خوش فکر شاعر تھے۔ غالب صرف اس لیے ہی عارف کو نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کی بیوی کے بھانجے تھے بلکہ ان کی جودتِ طبع اور ذہنِ رسا نے مرزا کی محبت حاصل کی تھی۔ وہ طرزِ سخن میں مرزا غالب کے پیرو تھے۔ ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مرزا غالب کو اِس خوش فکر ہونہار نوجوان سے جس قدر محبت تھی اس کا اظہار ان کے اس فارسی قطعے سے ہوتا ہے :

آں پسندیدہ خوئے عارف نام　　　کہ رخش شمع دودمانِ منست
آں کہ در بزم قرب و خلوت اُنس　　　غمگسار و مزاج دانِ منست

عارف کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

ہم ز کلکِ تو خوش دلم خوش حال　　　کاں نہال ثمر فشانِ منست

مگر افسوس عین عالمِ شباب میں عارف جن کو کبھی مرزا ''راحتِ روحِ ناتواں'' اور کبھی ''شمع دودماں'' کہتے تھے۔ ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲۶۸ ہجری بعارضۂ تپ و اسہال پینتیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اور مرزا غالب کے ٹوٹے ہوئے دل سے کراہ کی صورت میں یہ صدا نکلی :

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کا مزار حضرت محبوبِ الٰہیؒ میں اپنے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروف کے قبرستان[1] میں مرزا غالب کی پائینتی ہے۔

نواب دلہن کی وفات عارف سے چھ مہینے قبل دردِ گردہ کے سبب ہو گئی تھی۔ جوانمرگ بیوی کے غم کو عارف نے ایسا دل سے لگایا کہ خود بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ نواب دلہن کی وفات کے بعد سے بنیادی بیگم بن ماں کے بچوں کو سنبھالتی تھیں۔ عارف کے بعد جوان بیٹے کے غم نے بوڑھی ماں کو بھی جلدی ختم کر دیا۔ چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو عارف کی وفات کے بعد غالب نے لے لیا

---

[1] اب مزارِ غالب کے ساتھ ہی عارف کے مزار کو بھی اِس قبرستان سے الگ کر لیا گیا ہے۔

تھا۔ دادی کا انتقال ہوا تو باقر علی خاں کو بھی غالب لے آئے اور بِن ماں باپ کے بچوں کے ایسے لاڈ کیے کہ سب کو بھلا دیا۔ اگر ان نونہالوں کو غالب کی شفقت نہ ملتی تو خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا۔

عارف نے ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور ایک دیوان بھی ان کے رنگ میں مرتب کر لیا۔ لیکن غالب کی شاگردی کے بعد اس دیوان کو تلف کر دیا۔ اور طرزِ سخن میں مرزا کی پیروی کرنے لگے۔ دوسرا دیوان "مطلع مہر سعادت" مرتب کیا اور اپنے ذہنِ رسا سے حضرت غالب جیسے شہبازِ سخن کو فتح کر لیا۔ نواب سعید الدین احمد خاں طالب دیوانِ عارف کے دیباچے میں رقم طراز ہیں "گو عارف مرحوم حضرت غالب کے تلامذۂ ارشد میں نقشِ اول تھے مگر نقوشِ مابعد سے آب و رنگ میں کسی طرح کم نہ تھے بلکہ پُرگوئی میں افضل تھے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو واقعی مرزا کی توقع کے مطابق وہ اِن کے صحیح جانشین ہوتے۔"

طالب صاحب لکھتے ہیں:

" عارف خطِ نسخ کے بھی ماہر تھے اور اِس فن میں مشہورِ زمانہ خوش نویس میر جلال الدین کے شاگرد تھے۔ استاد کی توجہ اور اپنی محنت سے ایک سال کے اندر اتنی مشق بہم پہنچاتی کہ استاد نے اصلاح دینی چھوڑ دی اور سند لکھ دی۔ جلال الدین صاحب کے دونوں صاحبزادے نواب مرزا صاحب ظہیرؔ اور امراؤ مرزا صاحب انورؔ عارف کے ہی شاگرد تھے۔ عارف کی وفات کے بعد استاد ذوق کے شاگرد ہوئے۔"

عارف کو مشاعرے کرنے کا بہت شوق تھا۔ اِس زمانے میں مشاعرہ کرنا آسان نہ تھا تمام شہزادے، سلاطین زادے اور استادانِ فن، امرا، وروسا شریکِ مشاعرہ ہوتے تھے۔ ان کی باہمی چشمک کی بدولت سب کا سنبھالنا اور محفل کا نظام قائم رکھنا، ہر ایک کے مرتبے اور لیاقت کے مطابق اس سے برتاؤ کرنا ہنسی کھیل نہ تھا۔ اِس کے لیے بیحد ذہانت اور رکھ رکھاؤ کی ضرورت تھی۔ لیکن بھلا مرزا غالب کا ذہین فرزند کیوں نہ بزمِ سخن سلیقے سے آراستہ کرتا۔ جب کبھی بھی وہ میرِ مشاعرہ بنتے، اس خوش اسلوبی سے انتظام کرتے تھے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ تمام لوگوں کے حفظِ مراتب کا خیال رکھا جاتا تھا۔

دیوانِ عارؔف کے نسخے

دیوانِ عارف کے چھپوانے کی کوشش نواب ضیاء الدین احمد خاں نے بھی کی اور اِن کے چھوٹے صاحبزادے نواب احمد سعید خاں طالبؔ نے بھی۔ لیکن افسوس یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ مجھے اپنی بڑی خالہ محمد سلطان بیگم کے پاس سے دیوانِ عارؔف کا قلمی نسخہ مل گیا تھا۔ یہ دیوان وہ تھا جو نواب طالبؔ نے مرتب کیا تھا اور اس پر دیباچہ لکھا تھا۔ میں نے اس کے لیے مقالہ تیار کر کے رکھا تھا اور خیال تھا کہ انجمن ترقی اردو سے ڈاکٹر عبدالحق سے پیش لفظ لکھوانے کے بعد چھپواؤں گی۔ لیکن افسوس چند مہینے بعد ہی ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں یہ دیوان میری لائبریری کے ساتھ تلف ہو گیا۔ اب ایک مکمل دیوانِ عارف لوہارو سیکشن لائبریری رام پور میں ہے۔ یہ دیوان مرزا حیدر حسن خاں عارؔف کے چھوٹے بھائی کی ملکیت رہا ہے۔ اس کی ہی نقل کرا کے تصحیح ہونے کے بعد دیوانِ عارؔف چھپوا دینے کا ارادہ ہے۔

دیوانِ عارؔف کا ایک نسخہ سید آفاق حسین میر افضل علی عرف میرن صاحب کے نواسے مصنف نادرات غالبؔ کے پاس ہے۔ لیکن یہ دیوان مکمل نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرن صاحب نے اس کو بطور خود اِدھر اُدھر سے جو کلامِ عارؔف کا ملا یا جو ان کو یاد ہو گا لکھ کر جمع کر لیا اس کی ترتیب ٹھیک نہیں ہے۔ اور اصل دیوان کے مقابلے میں ایک تہائی کم ہے۔

بنارس لائبریری میں میں نے دو مکمل نسخے دیوانِ عارؔف کے دیکھے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں نے ترتیب دیا تھا اور اس کی ہی نقل نواب سعید احمد خاں نے کرائی تھی۔ یہ ہر طرح مکمل دیوان ہے۔ دوسرا دیوان بھی مکمل ہی ہے۔ حیدر آباد دکن سالار جنگ میوزیم میں جو کلیاتِ عارؔف ہے اس میں بھی ایک تہائی کلام نہیں ہے۔ اس کا عکس کرا کے میں نے ایوانِ غالبؔ کی لائبریری میں محفوظ کر دیا ہے۔

کلام پر ایک نظر

عارؔف نواب الٰہی بخش خاں معروؔف کے نواسے تھے، شعر و ادب کا ذوق اُن کو نانا سے ورثے میں ملا تھا۔ ایسے ذی علم نانا کی گود میں عارؔف نے آنکھ کھولی، پھر غالبؔ جیسے شہبازِ سخن سے استفادہ کیا۔ اس لیے اپنے ہمعصر شعرا میں عارؔف کو ممتاز درجہ ملا۔ اِس زمانے کے اردو شعرا کے

تذکرے عارف کے مداح ہیں، چنانچہ تذکرۂ شعرائے ہند مؤلفہ ۱۸۴۸ء مولوی کریم الدین عارف کے متعلق لکھتے ہیں :

"عارف تخلص، نام نواب زین العابدین خاں، خواہر زادہ نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب کے۔ ابتدا میں میاں نصیر سے شعر کہنا سیکھا اور اس کے ہی طور پر ایک دیوان بھی لکھا۔ مگر بعد آنے نواب اسد اللہ خاں مذکور کے اکبرآباد سے نصیر سے اصلاح لینا چھوڑ کر ان کی خدمت میں رہنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنے ڈھنگ پر ان کو کتب فارسی کی تعلیم اور اصلاح شعر کی دی، چنانچہ بہت دنوں بعد ایک دیوان مسمّی "مطلع مہر سعادت" انھوں نے فراہم کیا۔ اس میں قصائد اور قطعات، غزلیں اور مدحتیں، ترجیع بند اور مخمس و مسدس، معشر وغیرہ بہت موجود ہیں۔ میں نے بھی وہ دیوان دیکھا ہے۔ اس کو کلیات کہنا چاہئے۔ حقیقت میں یہ شاعر بڑے رتبے کا ذی قدر، قابل و لائق تحسین و آفریں ہے۔ فارسی میں بڑی دستِ قدرت ہے۔ جن ایام میں میرے چھاپہ خانے میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا یہی شاعر میر مجلس اور میر مشاعرہ مقرر تھا اور اس کے اشعار گلدستۂ نازنیناں نے بھی مندرج کیے ہیں۔ اب ان ایام میں بسبب جدت ذہن اور تیزی سخن سو کھ کر مثل کانٹا ہو گیا ہے۔ بہت دبلا پتلا ہے۔ لانبا قد ہے، داڑھی بھر کر نہیں نکلی، تھوڑی پر ہی کچھ بال ہیں، خلق اِس کا بہت اچھا ہے، اگر کوئی اِس سے ملاقات کرے بہت خط اٹھائے، فی البدیہہ کہنے کا بھی درک ہے، تاریخ کہنے میں بھی بہت اچھی قدرت رکھتا ہے، مادّہ بھی اچھا نکالتا ہے۔ چنانچہ میری کتاب گلدستۂ نازنیناں کے اختتام پر دو تاریخیں اس نے لکھی ہیں۔ ایک اردو، دوسری فارسی ہے۔ ایک مصرعِ اردو سے کیا اچھی تاریخ نکالی ہے۔ وہ یہ ہے :

"کہو گلدستۂ گلزارِ جنّت"

اِس مصرعے سے اس کتاب کے اتمام کی تاریخ نکلتی ہے۔ غرضیکہ شعر کہنے میں اس نے قدرت پائی ہے۔ کوئی غزل بجز ساٹھ اور اسّی شعر کے کل مضامین رنگا رنگ میں نہیں کہتا اور

ایک مشاعرے کا تذکرہ مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے "آخری شمع" کے نام سے تصنیف کیا ہے۔

سب اچھی اور مضمون نئے انداز پر ہوتے ہیں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر سے کمال ارتباط اور صحبت اس کو رہتی ہے۔ چونکہ دونوں صاحب وجہِ معیشت سے فارغ اور نواب زادے ہیں، باہم شعر و سخن کا چرچا اور صحبت رکھتے ہیں۔ اِس سال ۱۲۶۳ھ میں عمر اس کی قریب تیس برس۔ یہ اشعار شاعرِ مذکور ہیں جو مشاعرے[۱] میں میرے مکان پر پڑھے تھے۔ واضح ہو کہ یہ مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں تاریخ رجب ۱۲۶۱ھ میں شروع ہوا۔ اس سال درمیانِ ماہ ذی قعد کے بہ سبب بد دیانتی اور نا اتفاقی شرکا، کے جو مطبع کے شریکوں نے مجھ سے کی تھی موقوف ہوا۔ جائے پیدائش اور وطن عارف کا شاہ جہاں آباد ہے۔ لڑکپن سے آج تک یہیں رہے۔ کہیں کا سفر نہیں کیا۔ مکان ان کا لال کنوئیں پر ہے جو مدرسے کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی شعر بھی اچھے کہتے ہیں۔

تذکرہ گلستان سخن مؤلفہ ۱۲۷۱ ہجری میں تحریر ہے " عارف تخلص نام زین العابدین خاں خلف رشید جناب غلام حسین خاں مسرور شاگرد مرزا اسد اللہ خاں غالب غفر اللہ تعالیٰ، زبان اردو کو ہم پلۂ فارسی مضامین شعر کو ہم پایۂ حکمت کر دیا تھا۔

رنگینی سخن سے کاغذ ہر رنگ گل اور دل پذیری کلام سے قلم منقار بلبل اصناف سخن پر قدرت اور انواع کلام پر اقتدار۔ غزل صحرائے شوخی کا غزال۔ قصیدہ گلشن متانت کا نہال مخمس جس میں کلام کے واسطے حواس، رباعی مانند عناصر اربعہ پیکر سخن کی اساس، ۱۲۶۸ھ میں رخت سفر باندھ گلشن جناں کی طرف راحل ہوا میر حسن تسکین کی تاریخ وفات بعینہٖ اس بلبل باغ جنت کی تاریخ ہے۔ تماشائی تذکرہ اِس مقامات کی سیر کے ان مقدمات سے مطلع ہو چکے ہیں۔ کاش عارف کے احوال میں تجاہلِ عارفانہ کو کام نہ فرمائیں۔ دیوانِ ضخیم اس کی یادگار ہے۔"

آثار الصنادید مؤلفہ ۱۲۶۳ھ میں سر سید مرحوم فرماتے ہیں:

" نواب زین العابدین خاں بہادر عارف تخلص، بلبل چمنستان سخنوری، طوطیٔ

---

[۱] دیکھیے مشاعرہ آخری شمع فرحت اللہ بیگ

شکرستانِ معنی پروری، خلف رشید نواب غلام حسین خاں مسرور، ابن شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ خاں بہادر سہراب جنگ نے مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں مشق سخن بہم پہنچائی ہے اور تحقیقِ علمی، تفتیش محاورات انہی کی خدمت فیض منقبت میں کی ہے اور فی الحقیقت اس فن میں وہ کمال حاصل کیا ہے کہ شعرائے زمانہ قدیم یعنی میر و سودا، قائم، کلیم اگر اس زمانے میں ہوتے بیشک اس زبدۂ کمال کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتے۔ کمال کی علامت اس سے زیادہ کی ہوگی کہ شاگرد پر استاد کو ناز ہے، کیوں نہ ہو، ان وضع جدید نے اسلاف کی کہنہ طرزوں کو آب عرق سے دھو دیا۔ اب وہ روز گار ہے کہ ہر سمت میں کمال و ہنر اس صاحبِ علم کا بلند ہے۔"

غرضیکہ مولوی کریم الدین نے یا صاحبِ گلستانِ سخن یا جناب سرسید ان سب ہی نے عارف کے کمال فن کی دل کھول کر داد دی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس زمانے کے رواج کی طرح "تعریف" میں مبالغہ سے کام لیا گیا۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جوانمرگ عارف پر غالب کا اثر کافی تھا اور ان کی فطری صلاحیت کو غالب کی تربیت نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ وہ خوش گو و خوش فکر شاعر تھے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یقیناً علم و ادب کی دنیا میں ان کا نام اور بھی چمکتا لیکن افسوس تو یہ ہے کہ انھوں نے جتنا اپنا اردو فارسی کلام چھوڑا وہ بھی شہر آشوب کی دستبرد کی نذر ہو گیا۔ موجودہ دیوان بھی اگر ان کے عزیز دوست نواب ضیاء الدین احمد خاں رخشاں نہ لکھواتے تو صرف ہم لوگوں کے لیے عارف کا نام ہی رہ جاتا اور کلام غائب ہو جاتا۔ ان کے دیوان کو اس زمانے کے تذکروں میں ضخیم کیا گیا ہے تو خیال ہے کہ زیادہ نہیں تو آدھا کلام عارف کا ضائع ہو گیا۔

عارف نے غالب کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب رہے ان کی ایک غزل اور ایک مخمس بھی غالب کی غزلوں پر پیش ہے۔

اس غزل کا مطلع ہے:

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور راز داں کوئی نہ ہو

مخمس کا پہلا بند ہے:

مدت ہوئی ہے عیش کا ساماں کیے ہوئے　　روشن چراغ مے سے شبستاں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے حجرہ گلستاں کیے ہوئے　　مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

حضرت غالبؔ کو مخاطب کر کے عارفؔ نے تین قطعے کہے ہیں۔ پہلے قطعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے عارفؔ کی یہ شکایت غالبؔ سے کی، مرزا غالبؔ کو اُن کی غیبت میں عارفؔ برا کہتے ہیں۔ اپنی صفائی میں عارفؔ نے یہ قطعہ کہا ہے جس کے دو شعر ہیں:

قبلۂ جان و دل ترا فدوی　　تجھے کہوے برا یہ طاقت ہے
اسد اللہ نام ہے تیرا　　اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے

اور اس قطعے کے ایک شعر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کیوں غالبؔ نے عارفؔ کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا اِس میں یہ بھی کہا تھا۔ ع

مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیرؔ سے لڑائی

ایک زمانے میں نواب نیرؔ اور نواب عارفؔ کی باہمی چشمک تھی۔ عارف کا یہ شعر اس قطعے میں اس کا گواہ ہے ؎

نیرؔ و محوؔ ہیں میرے دشمن　　آسماں کی انھیں نیابت ہے

یہ پورا قطعہ ان کے کلام کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔

عارفؔ پر غالبؔ کا اثر غالب تھا اس لیے اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کو شیعہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ وہ خوش عقیدہ سنی تھے۔ تعزیہ داری اور مجلسیں کرنا خاندان لوہارو میں عام تھا جب تک ریاست باقی رہی تیرہ دن تک باقاعدہ محرم میں مجلس ہوتی تھی جس میں نواب خود مع اپنے خاندان کے شرکت کرتے تھے۔ نذر نیاز کے لیے ایک پیر صاحب الگ تعینات تھے اور ایک گاؤں کی سالانہ آمدنی اہلِ بیت کی نذر کے لیے وقف تھی۔ ؎ عارفؔ کے سوتیلے بھائی غلام حسن خاں محوؔ۔

؎ حالانکہ یہ لڑائی بعد میں ایسی محبت میں تبدیل ہوئی کہ عارفؔ کے بڑے بیٹے مرزا باقر علی خاں نواب زین العابدین احمد خاں نیر رخشاں نے اپنی لاڈلی بیٹی معظم زمانی بیگم کو بیاہ دیا۔

عارف خوش عقیدہ مسلمان تھے۔ انھوں نے بزرگانِ دین کی شان میں کافی سلام اور منقبت کہتے ہیں۔ سرورِ عالم کے لیے جو نعت کہی ہے۔ اُس کا پہلا شعر ہے :

رتبے میں خطۂ دہلی نہیں کچھ عرش سے کم
یعنی موجود ہے اس جا پہ ترا نقشِ قدم

حضرت مولانا فخر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں والی جھرکہ فیروز پور اور لوہارو کے پیر تھے۔ اس لیے سارا خاندانِ لوہاروان کا مرید تھا۔ ان کے لیے چار صفحے کی منقبت عارف نے کہی ہے اس کے علاوہ قدسی کی فارسی لغت پر ع

"دل وجاں یاد فدایت کہ عجب خوش لقبی"

پر مخمس ہے اور باوجود کافی کلام ضائع ہونے کے جو دیوان باقی رہ گیا ہے وہ ادب اردو کا ایک اچھا سرمایہ ہے۔

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو

ملک صحرائے جنوں میں آپ کیجے سلطنت
چلیے ایسے شہر جس میں مرزباں کوئی نہ ہو

آپ ہی حاکم رہیں اور آپ ہی محکوم ہوں
دوسرا اپنے سوا زنہار واں کوئی نہ ہو

خضر تک آنے نہ پاوے کیجیے وہ بندوبست
نام کو باآنکہ اس جا پاسباں کوئی نہ ہو

کیجیے آراستہ گر محفلِ عشرت فزا
مہتمم اپنے سوا اس کا بھی واں کوئی نہ ہو

تندئ مے سے رہے ساغر کو گردش خود بخود
میکدے ہوں سیکڑوں پیرِ مغاں کوئی نہ ہو

لال مت سمجھو زبانِ شمع کو خامش ہے یہ
بات یہ کس سے کرے جب ہم زباں کوئی نہ ہو

سلہ یہ روایت خاندان لوہارو میں مشہور ہے کہ احمد بخش خاں چودہ سال کی عمر سے مولانا فخر صاحب کے مرید ہو گئے تھے۔ ان کو حضرت مولانا ہمیشہ "آئیے والئ میوات" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ گویا والئ فیروز پور جھرکا ہونے کی انھوں نے پیش گوئی فرما دی تھی۔ مولانا فخر صاحب کے سلسلے کے ایک برگزیدہ بزرگ شاہ ثناء الدین صاحب کی ذاتِ اقدس سے فیض باقی تھا۔ افسوس ان کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہو گیا۔

ہیں مرے گلہائے داغِ سینہ خودداری صبا　　یہ وہ گلشن ہے کہ جس کا باغباں کوئی نہ ہو
مریئے اس حسرت میں گر قاتل نہ ہاتھ آوے کہیں　　روئیے اپنے پہ خود گر نوحہ خواں کوئی نہ ہو

شکوہ کس سے کیجئے خالق کی مرضی ہے یہی　　نکتہ چیں پیدا ہوں لاکھوں نکتہ داں کوئی نہ ہو
ہاں خدا تو دیکھتا ہے لاکھ چھپ کر روئیے　　وہ جگہ لاؤں کہاں سے میں جہاں کوئی نہ ہو
مجھ تلک قاتل تو قاتل موت بھی آتی نہیں　　کس کو دیجے جان جب خواہانِ جاں کوئی نہ ہو
مانے گر کوئی نصیحت عارفؔ دل خستہ کی
بھول کر بھی والۂ آتش رخاں کوئی نہ ہو

مدت ہوئی ہے عیش کا ساماں کیے ہوئے　　روشن چراغِ مہ سے شبستاں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے حجرہ گلستاں کیے ہوئے　　مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے
صورت یہی ہے تو کوئی دم میں ہوا ہے دم　　اب زندگی سے ایسے نہایت خفا ہے دم
پھر پاس ننگ و نام سے گھبرا گیا ہے دم　　پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
کیا کہیے کیا شفیق ہمارا ہوا ہے عشق　　ہر دم ہمارے واسطے راحت فزا ہے عشق
گویا کہ بیش کار لبِ دل رہا ہے عشق　　پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
ساماں صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر تار ساز شکوہ دلدار ہے نفس　　پھر پیرہن میں حوصلہ کے خار ہے نفس
پھر داغ شعلہ خیزیٔ اظہار ہے نفس　　پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے
نکلے تو نکلے کوچۂ قاتل میں آرزو　　کیا کیا ہے اپنے اس دلِ بسمل میں آرزو
اک جنگجو کے ملنے کی دل میں آرزو　　چلاہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

معلوم کیا کرے کوئی اِس رنجِ سخت کو　　تاب و تواں کی کھود کے بیخ درخت کو
برباد کرکے صبر کے سامان درخت کو　　کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

بند گراں ہے عاشق ناکام پر ہوس　　اندیشۂ طائر اور نفس دام پر ہوس
قانع نہیں ہے نامہ و پیغام پر ہوس　　مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اِک یارِ دل نواز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　اندازِ جاں گداز کو تاکے ہے پھر نگاہ
اک چشمِ فتنہ ساز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　اِک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

گو وہ صدا بغل میں عدو کے پڑے رہیں　　پیویں ہم اپنے گھونٹ لہو کے پڑے رہیں
پیاسے ہی واں پڑے رہیں بھوکے پڑے رہیں　　پھر جی میں ہے کہ در پہ کسو کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

چاہوں ازل کا آوے اگر میرے ہات دن　　آخر ہوں زندگی کے بصبر و ثبات دن
کٹ جائیں ایک وضع پہ ہفتے کے سات دن　　جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

عارفؔ میں پاکے لوئے دل آغوشِ اشک ہے　　بھرتا ہوں جامِ چشم کو سرجوشِ اشک ہے
آتی ہے یہ صدا لبِ خاموشِ اشک ہے　　غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک ہے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

عجائب لوگ ہیں دہلی میں عارفؔ　　خدا جانے کہاں کے ہیں کدھر کے
نہیں کچھ اس میں شک رہتے ہیں دشمن　　فلک سے بھی سوا اہلِ ہنر کے
سخن سنجانِ پورب پہ غش ہیں　　سدا ہیں تشنہ ان کے شعرِ تر کے
انھوں کا سب ہی گر شعر سن لیں　　گریباں پھاڑتے ہیں آہ کر کے

ہمارا شعر گو ہو سب سے بہتر　　سنیں اس کو نہ ہرگز کان دھر کے
مثل ان پر یہی آتی ہے صادق　　ملیدہ تیل کا بیروں کو گھر کے

قطعات

قبلۂ جان و دل ترا فدوی　　تجھ کو کہوے برا یہ طاقت ہے
اسد اللہ نام ہے تیرا　　اِس بزرگی کی کچھ نہایت ہے
وردِ نامِ بزرگ کا تیرے　　اس میں کچھ رشک نہیں عبادت ہے
حق نے سب پر کیا تجھے غالب　　تجھ سے رُوکش ہو کس کی طاقت ہے
مجھ کو زیبا ہے جتنا ناز کروں　　مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے
نظرِ منشیٔ فلک کی مجھے　　کچھ نہ پروا ہے کچھ نہ حاجت ہے
عرض کرتا ہوں شکوۂ حسّاد　　گرچہ میری خلاف عادت ہے
وہ سبب میں بیان کرتا ہوں　　ان کی جس وجہ یہ شرارت ہے
فیضِ صحبت سے تیری تیرا اعلام　　جو بدل قائلِ امامت ہے

بنے اس زمرہ
نیّر و محوؔ ہیں میرے دشمن　　آسماں کی انھیں نیابت ہے
بات ان کی لگی ہے پتھر سی　　دل میں اُن کے زبس قساوت ہے
ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر　　ایک آفت ہے اک قیامت ہے
ایک جلتا ہے رشک سے دائم　　بس کہ عزت اُسے نہایت ہے
دوسرا محوؔ کینہ جوتی ہے　　یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے
زور کرتے ہیں ناتوانوں پر　　زور ہے گر یہی شجاعت ہے

بدیع عطا جو کرتا ہوں میں قسم　　آوے پسند حضرتِ غالب تو واہ واہ
آتے ہیں اِس طرح کے لطیفے جو فکر میں　　یہ رنگ طبع کا میری ہوتا ہے گاہ گاہ

کیا کروں عرض قبلہ حاجات تھا عجب رنگِ محفل انشاد
حالِ دوشینہ کیا کروں تحریر رات تھی یا کہ شخص کور سواد
شمعِ روشن نظر نہ آتی تھی ایک اندھیر تھا جو حد سے زیاد
تھی سخن کی کساد بازاری کیسی دادِ سخن کہ تھی بیداد
خام گویوں کی جب بندھی یہ ہوا فکرِ بالغ کلام ہے برباد
بات ہی جن کو کر نہیں آتی زعم میں اپنے ہو گئے استاد

میں نے ہی رات کو پڑھی تھی غزل لا کے اوّل زباں پہ یا استاد
لبِ نازک پہ تھی سبھوں کی نظر یعنی یہ دو محل ہیں مظہر داد

تھا اثر وہ کلام شیریں کا بند جس سے ہوئے لبِ حسّاد
کیوں میری خلدِ طبع سے نکلی مجھ کو افسوس ہے یہ حور نژاد
ان کی گلگشت کے نہیں قابل خارزار و خرابۂ الحاد
کب یہ آب و ہوا موافق ہو سرمہ جس جائے ہے گر کساد
روحِ مرزا دبیر ہووے خجل گر کہوں کچھ بقدرِ استعداد
اس منزل پہ خود ہوں دانستہ ہوں ازل سے زبس لطفِ نہاد
دیکھے میرا جو مصرعہ موزوں رشک سے باغ میں کٹے شمشاد
قبلہ گاہا! ہزار توبہ ہے کہ میں جاؤں یہ محفلِ حسّاد
شکوہ کس کا کروں کہ ہیں مجبور شعر سمجھیں وہ کیا نہ ہو جو سواد
یہی کہہ کہہ کے روئیے عارفؔ نکتہ دانی کہیں نہیں، فریاد

اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
اٹھا قدم جو آگے کو اب رہبر نہیں پیچھے تو چھوڑ آتے کہیں اس کا گھر نہیں

منقبت (حضرت عمرؓ)

ایزدِجانِ آفریں کو کرکے کہتا ہوں گواہ
گر نہ تیرا عشق ہو مجھ کو تو میرا رو سیاہ

لائقِ تختِ خلافت تھی ازل سے تیری ذات
تجھ کو ارزانی ہو یہ اے بادشاہِ دیں پناہ

ہے لقب فاروق تیرا، فرق تو نے کر دیا
حق و باطل میں نہ رکھا تو نے باقی اشتباہ

تیرے امر و نہی نے صورت بدل دی دہر کی
جس جگہ تھا میکدہ اس جا بنی ہے خانقاہ

تیرے دارالعدل میں پھر کیوں ہو خلقت کا ہجوم
کس پہ ہوتا ہے ستم جو آوے کوئی دادخواہ

حکم جاری جس کا دریا پر بھی ہوئے اسطرح
کوئی تجھ سا حکمراں ہے کوئی تجھ سا بادشاہ

حلقۂ خود و سپر سے کیا بچیں تیرے عدو
تیری شمشیرِ عدوکش کی نہیں ہرگز پناہ

ضربِ الا اللہ سے تو نے گرا دی یوں نعل
بادِ صرصر سے گرے ہے جس طرح برگِ گیاہ

کیا شجاعت کے ترے اوصاف ہوں مجھ سے رقم
دیکھ کر شیرِ خدا کہتے ہیں تجھ کو واہ واہ

عام جب سے ہوگئی ہے معدلت رانی تیری
چرخ پر بت سے نظر آتے ہیں یکساں مہر و ماہ

ناگہاں عالم کو ہو جاتا ہے دن کا اشتباہ

آنکھوں کی راہ وہ مرے دل میں اتر گئے
کیا جلد مل گئی انھیں آسان راہِ دل

ایسی وہ کیا جگہ تھی کہ کرتے بت اس میں جا
کعبہ پہ ہو گیا تھا انھیں اشتباہِ دل

آجائے تو جو سامنے اے غیرتِ بہار
ہو جائے دفعتہً مرے سینے کا داغ گل

سامانِ بزمِ عیش جو پوچھے تو ہم سے پوچھ
عارفؔ شراب، یار، صراحی، ایاغ، گل

کیوں دشمنی کے غم میں رہیں کر کے دوستی
بے گانہ وار ملتے ہیں ہر آشنا سے ہم

عارفؔ نہ پی شراب، تجھے اختیار ہے
پر ہم تو کہہ کے ہو گئے داخل ثواب میں

مر تو جائیں گے تری فکرِ خریداری میں
گو کہ قیمت کا تری اپنے میں مقدور نہیں

دیکھتے ہی ساغرِ مے نشہ ہو جاتا ہے کیا
اس کی آنکھیں اور ہیں صہبا کے ساغر اور ہیں

جو ہے تیری طرزِ دل کش وہ کہیں ثانی نہیں
دہر میں ہونے کو عارفؔ یوں سخن ور اور ہیں

چاندی کا وہ خدا نے سراپا بنا دیا
خالی طمع سے جیب بھی کوئی سیمبر نہیں
اٹھتا قدم جو آگے کو اب رہبر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

کیوں ہمیں دیکھنے گھبرا کے تم آئے صاحب
تم تو کہتے تھے محبت میں اثر خاک نہیں

پہنچانے کو اٹھے تھے اسے تھوڑی دور تک
جا پہنچے شہرِ یار میں ہم نامہ بر کے ساتھ

مجھ کو اور آپ کو عالم میں رسوا نہ کیجے
آپ ہو رہیے میرے یا مجھے اپنا کیجے
خانۂ یار کی جانب ہمیں معلوم نہیں
شوق میں چاروں طرف کیوں نہ سجدہ کیجے
کس کو سونپوں جو نہ میں تجھ کو خدا کو سونپوں
اور عالم میں کہو کس کا بھروسہ کیجے
گھر کے لٹنے ہی سے تم غم میں پڑے ہو عارفؔ
اور کیا کیا وہ ابھی کرتے ہیں دیکھا کیجے

دیکھے عالم میں ہیں صابر کہیں انساں ہم سے
کبھی شکوہ بھی سنا گردشِ دوراں ہم سے

بادشاہی پہ ہو مغرور کوئی کیا عارفؔ　　نہ وہ چنگیز نہ وہ شوکت چنگیز رہی

سہتے ہیں مشکل کو ہم دیکھ کے اس کی عارفؔ　　مانگتا ہے جو ہمارا کوئی دیواں ہم سے

جبہ سا دیکھیے جبرئیل کو جس جا عارفؔ　　شک نہیں وہ ہی درِ آلِ عبا ہوتا ہے

جہاں سے دوشِ عزیزاں پہ بار ہو کے چلے　　بہ سوئے ملکِ عدم شرمسار ہو کے چلے

ہوتا سلوک برہمن و شیخ میں اگر　　کتنی قریب دیر سے کعبے کی راہ تھی

سلام

سلام قبلۂ حاجاتِ دو جہاں پر ہے　　جہاں کو سجدہ روا جس کے آستاں پر ہے
جزائے صبر جو موقوف امتحاں پر ہے　　جفا و جور شہنشاہِ انس و جاں پر ہے
وفورِ گریہ سے جاری ہے سر پہ چادر آب　　ردا کہاں سرِ بانوئے خستہ جاں پر ہے
مُوا ہول میں ترے غم میرے مقابل آئے　　خضر کو ناز اگر عمرِ جاوداں پر ہے

انسان ہو کے منتِ حیواں اٹھائیے　　بچتے پھرے ہیں سایۂ بالِ ہما سے ہم -

---

کیا کہیں ہم کہ عشق میں کیا کھاتے ہیں　　کوئی دن اور ہیں دنیا کی ہوا کھاتے ہیں

تم سے مشہور ہوا میں تو ہوئے تم مجھ سے　　نامور آپ ہیں تو بندہ بھی گمنام نہیں
لوگ ہم سے بھی اڑا دیں تو اڑا دیں عارفؔ　　طرز یہ خاص ابھی تک تو کہیں عام نہیں

دُہرے ہوئے جو شرم سے وہ پیچ و تاب میں　　حسن ان کا ہو گیا ہے دوبالا حجاب میں

گویند مرد خوار بود با گریستن — رفت آبروی چشم من از نا گریستن
امروز نقدِ عیشِ چرا می دہی ز کف — از عقل نیست در غمِ فردا گریستن
محو است در تصورِ حسن تو چشم من — دیگر چه کار ماند مرا با گریستن
سر زد بروں ز کلبۂ من سیل اشک من — پنہاں نماند راز ز تنہا گریستن
رحم آیدش به بی اثری ہائے گریه ام — ضائع نگشت در دلِ شبہا گریستن
ساقی مگر بچشم گلویش فشردہ — کاغاز کرد شیشۂ صہبا گریستن
رانند سوی باغ جناں رہ گزر کوی دوست — بایدت بسر بزیرِ سایۂ طوبیٰ گریستن
سنت بود بچشم من از روز نو درشش — زیں راہ کردہ دوست تماشا گریستن
پنہاں بزیرِ چادرِ آب است روی من — نازم به پردہ داری پیدا گریستن
من خستہ تن به بستر و بستر بحالِ من — دارد به چشمِ صورتِ دیبا گریستن
بریک دو قطرہ نیز قناعت کنم کنوں — رفت آنکه بود دجلہ و دریا گریستن
بے شست و شوی گریه نظر پاک کے شود — فرض امت در وصال تو برما گریستن

ترسم به گردن تو بود خون عالمی
عارف نگہدار خدا را گریستن



نواب علاءالدین احمد خاں علائی والئ لوہارو

نواب علاءالدین احمد خاں علائی نواب امین الدین احمد خاں کے فرزند ارجمند تھے فخرالدولہ دلاور الملک، رستم جنگ نواب احمد بخش کی خاندانی بیگم کے بڑے صاحبزادے تھے۔ امین الدین احمد خاں پہلے والئ لوہارو ہیں۔ ان کے گرامی قدر والد نواب احمد بخش خاں تو والی جھرکا فیروزپور و لوہارو تھے۔ امین الدین احمد خاں ۱۲۲۹ ہجری (خندہ از لطفِ الٰہی زد بہنگام سحر) یعنی ۱۸۱۴ء (دولت و اقبال و بخت و سال ایں بادا جوان) میں فیروز پور جھرکا میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات بروز جمعہ ۳۱ر دسمبر ۱۸۶۹ء مطابق ۲۷ر رمضان ۱۲۸۶ ہجری) کی نصف شب کو ہوئی۔ وفات کی تاریخ "سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْریٰ بِعَبْدِہٖ لَیْلًا" سے نکلتی ہے۔ کوٹھی مرزا بابر والی اپنی خاندانی ہڑواڑ قطب میں دفن ہوئے۔ نواب امین الدین احمد خاں کی شادی نواب غضنفرالدولہ محمد وزیر بیگ عرف مینڈھو خاں رسالدار سلطنت اودھ کی صاحب زادی ولی النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ ان بیگم کے بطن سے علاءالدین احمد خاں ۲۵ر اپریل ۱۸۳۲ء مطابق ۲ر ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ علائی نے تعلیم مرزا غالب کی نگرانی میں پائی۔ مرزا صاحب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے اور برابر خط لکھتے رہتے تھے۔ اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی میں علاءالدین احمد خاں کے نام کئی خط ہیں۔ اپنے چہیتے شاگرد کے کہنے پر فکرِ سخن بھی غالب کرتے تھے۔ علائی اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے ذوق کے مطابق فارسی میں کلام زیادہ ہے، غالب نے انھیں ایک سند دی اور اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا۔

علائی کا زیادہ وقت علمی اور ادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ لوہارو میں ایک چھاپہ خانہ بھی فخرالمطابع کے نام سے قائم کیا تھا جہاں سے علمی و ادبی کتابیں شائع کرتے رہے۔ ایک پندرہ روزہ اخبار 'امیرالاخبار' کے نام سے اس مطبع سے نکلتا تھا۔ نواب علائی شطرنج کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ ۱۸۶۶ء یکم نومبر کوان کی کوٹھی واقع بلیماران پر شطرنج سوسائٹی کا پہلا جلسہ ہوا تھا۔ پھر یہ جلسے بہت دنوں تک ہوتے رہے۔ اس کے ایک سرگرم ممبر ریورنڈ وہٹلی صاحب بھی تھے اور ممبروں میں مرزا قربان علی بیگ خاں سالک، مرزا غلام حسن خاں محو کے نام بھی شامل ہیں۔ اس سوسائٹی کی روداد 'اکمل الاخبار' چھپتی رہتی تھی اور انگریز ممبروں کے ذریعے کھیل کے نقشے یورپ بھی جاتے تھے۔ علائی اپنے والد کی زندگی ہی میں لوہارو کے نواب ہو گئے تھے۔ کیونکہ نواب امین الدین احمد خاں عمر کے آخری حصے میں بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کے دماغ پر بھی اس بیماری کا اثر تھا۔ علائی مسند نشینی کی تاریخ ہے۔ ریاست خداداد' باقاعدہ اختیارات و خاندانی خطاب نواب فخرالدولہ دلاور الملک، رستم جنگ ۱۵ راگست ۱۸۷۴ء کو لارڈ نارتھ بروک کے عہد میں ملا

نواب علائی کی شادی جلال الدین احمد خاں نبیرہ نواب نجیب الدولہ کی صاحب زادی شمس النساء بیگم سے ۱۸ رفروری ۱۸۵۵ء مطابق ۳۰ رجمادی الاول ۱۲۷۱ھ کو نجیب آباد میں ہوئی۔ ان بیگم کے بطن سے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ امیرالدین احمد خاں، فرخ مرزا عزیزالدین احمد خاں نصیرالدین احمد خاں، بشیرالدین احمد خاں، ضمیرالدین احمد خاں۔

علائی کی وفات بروز جمعہ ۳۱ راکتوبر ۱۸۸۴ء مطابق ۱۱ محرم الحرام ۱۳۰۲ھ کو ہوئی۔ قطب صاحب میں کوٹھی مرزا بابر والی اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امیر مینائی نے تاریخ کہی

ع: مزارِ سایۂ یزداں علاء الدین احمد خاں

نواب علائی غالب کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ وہ کبھی علائی کو "اے میری جاں!" اور کبھی "مرزبان لوہارو" کہہ کر مخاطب کرتے، اور کبھی بڑے پیار سے اپنے شعروں میں علائی کا تذکرہ کرتے۔

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی — تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی — ایک بیدادِ گر رنج فزا اور سہی

اردوئے معلیٰ میں علائی کے نام غالب کا خط ہے انھوں نے نواب علائی کو ہدایت کی تھی کہ یہ

غزل جھنجھوٹی کے سروں میں گائی جائے۔

ناظم مہرولی کا ایک مشہور قطعہ ہے جس میں عنصری سے لے کر جامی تک تمام سربرآوردہ شعراء کا ذکر ہے اس کا آخری شعر ہے:

زخسرو چو نوبت بہ جامی رسید　　زجامی سخن را تمامی رسید

مرزا غالب فرماتے ہیں:

زجامی بہ عرفی و طالب رسید　　زعرفی و طالب بہ غالب رسید

علائی نے اس سندِ جانشینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس پر اور اضافہ کیا اور کہا:

علائی چوں بر جائے غالب نشست　　ورق بر درید و قلم در شکست

افسوس ہے کہ نواب صاحب موصوف نے اپنے کلام کو کبھی جمع کرنے کی کوشش نہیں کی اور جس پایے کے وہ عالم و فاضل تھے اس کے مقابلے میں کوئی بڑی علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ ایک قلمی بیاض لوہارو کے کتب خانے میں ان کی تھی جو اب رضا لائبریری رام میں ہے۔

مکالمہ مابین نواب صاحبان رام پور و لوہارو بوقتِ معانقہ

نواب کلب علی خاں　:　خوشا وقتے و خرم روزگارے

فی البدیہہ حضرت علائی　:　بہ امیدش رسد امیدوارے

مصرع جسے بچایا گیا　ع　کہ یارے برخورد از وصلِ یارے

قطعہ علائی گمندہ اتواپ لوہارو ۱۸۷۷ء

ہنگام سنج توپ نہنگ ہنگ کوہ کوب　　تند از خروش ورعد زاو شرارہ بار

نواب علائی کے پڑپوتے نواب امین الدین احمد خاں ثانی شہریار مرزا اس بیاض کو عرشی صاحب کی نگرانی میں چھپوا رہے ہیں۔ کچھ اشعار و قطعات علائی کے نواب شہریار کی مثنوی "انبساط و انتشار" سے لے کر لکھ رہی ہوں۔ میری اپنی تصنیف 'غالبِ اعظم' جو تقریباً ۱۹۴۷ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ نواب علائی کے نام دو خط کتب خانہ لوہارو سے ملے تھے اور علائی کے متفرق اشعار تھے۔ افسوس میری لائبریری کے ساتھ ہی تصنیف کا مسودہ، خطوط اور اشعار ضائع ہو گئے۔

دشمن گداز و پیل شکن رستخیز خیز　　آتش فشاں و برق نشاں اژدہا شکار
عالی جناب اجرٹن پنجاب حکمراں
بخشد از کرم بہ علائی جہاں نثار

تاریخِ وفات مرزا غالبؔ :

خاقانِ سخن بدیلِ سحباں　　آں غالبؔ نکتہ سنج و دانا
در عمر دو سی و سہ و دہ کرد　　بدرا و جہاں بے بقا را
از حکمِ غیب سال جستم　　"خاقانیٔ وقت" وائے گفتا

۱۲۸۵ھ

علائی کی بیاض سے مالک رام صاحب نے جو اشعار لے کر تلامذۂ غالبؔ میں شامل کیے ہیں وہ یہ ہیں۔

الطافِ حق کو وقتِ مصیبت تو یاد رکھ　　ہرگز نہ ہو بلا و عنا میں تو ناصبور
روتا ہے وقتِ رنج و بلا بھول کیوں گیا　　آرام و عافیت وہ تمام عیش اور سرور
کتا بھی در سے اپنے خدا وند کے کبھی　　دو چار پانچ فاقوں میں ہوتا نہیں ہے دور
بس شرم کر کہ تھوڑی سی زحمت میں ہائے ہائے　　کر یاد لطفِ سابق اے بندۂ کفور

اللہ ری بے ثباتیِ عمرِ فنا پسند　　بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ
شکوہ ہے کیوں قبول میں گر ہو مضائقہ　　آخر کسی کا نام تو نوں ہیں دعا کے ساتھ
درماں پذیر درد اگر ہے تو خاک ہے　　دیں جاں کیوں نہ درد کے بدلے دوا کے ساتھ

مشتِ خاکستر ہے وہ بلبل کہ گلشن میں نہیں　　داغ ہے وہ دل کہ خوں کے ساتھ دامن میں نہیں

دنیا کو خیر و خوبی میں لیل و نہار کو　　کب جانتی ہے خلق کہ کیوں کر گزر گئے
راتیں جو تھیں تمام ہوئیں نائے نوش میں　　دن یوں کٹے کہ گھر سے اِدھر کو اُدھر گئے
جب عافیت کا قافیہ ہوتا ہے تنگ تر　　روتے ہیں ان دنوں کو کہ ہے ہے کدھر گئے

آوارگانِ گل کدۂ آز و آرزو
حاشا اگر تمھیں سرِ سیر و فراغ ہے

رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشم و دل
کیجو سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے

وہ گل جو آج ہے قدحِ موجِ خیز رنگ
وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے

کل چور ہو گا سنگِ جفائے سپہر سے
گویا کہ غمکدے کا شکستہ ایاغ ہے

اور لالہ تند بادِ حوادث سے خاک و خوں
گویا دل و جگر کا کسی کے وہ داغ ہے

جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پہ آج دل شکن آوازِ زاغ ہے

مغرور جاہ سے یہ کہو تم علائیا!
کل ایک سطحِ خاک ہے جو آج باغ ہے

فارسی کا کلام یہ ہے:

پیدا نہ بود پیشِ ازیں خود عیانِ ما
برداشت پردہ گریہ ز رازِ نہانِ ما

مشکل بہ بیں چگونہ ز خویشتن خبر دہیم
کآتش بنامہ در زدہ سوزِ بیانِ ما

از سوزش است رونقِ ما چو نہالِ شمع
عینِ بہارِ ماست ہمانا خزانِ ما

سازِ جرس ز نالۂ سر کم بہ کوئے دوست
محتاجِ راہبر نشود کاروانِ ما

پروانہ نیستم کہ از تابِ جاں دہیم
بر شاخِ شعلہ بستہ فلک آشیانِ ما

تلخیِ دردِ ہجر ز بس در تنم نشست
زیں بس ہما ہمی نخورد استخوانِ ما

لیلیٰ کند ملامتِ ما زاں سبب کہ قیس
گم کردہ راہِ شوق ز شورِ فغانِ ما

گوئی کہ معجز است علائی بادلِ حزیں
ریزد شرارہ جائے سخن از زبانِ ما

روزے نہ شد کہ اشک ز فرقم گزر نہ کرد
از سر گزشت و دامنِ افلاک تر نہ کرد

در مرگ نیست بر سرِ من منت از اجل
تیر تو کار کرد، دعائے سحر نہ کرد

تا سہل تر بمیرم و بسمل تپیم بہ خاک
از غمزہ کشت لیک بسویم نظر نہ کرد

ہاں خدارا! زودتر گوئید با جانانِ من — کے رسی آخر؟ جاں برلب رسید اے جانِ من
دعویِ الفت مکن، اے قیس! کاندر راہِ عشق — بر تو دشوار است تمکیں، داں بود آسانِ من

نازم شبِ وصلِ صنم، مہ جلوہ جاناں در بغل — من گشتہ از خود بے خبر، او خفتہ آساں در بغل
زلفے و صد مشکِ ختن، چشمے و چندیں سحر و فن — روئے و گل در آستیں، بوئے دبستاں در بغل

رباعی

صد رہ بہ خطا زمرد معذوری بہ — صد رہ بہ عیوبِ دوست مستوری بہ
فتویٰ کہ زپیرِ دل گرفتم، اینست — قربے کہ بہ عادل نبود، دوری بہ

اے چرخ چرا ستیزہ با ما داری — دانم کہ غلط نہ، نہ بے جا داری
خواہی کہ دہی نقشِ وجودم برباد — آرے کہ مرا بہ ہر یکتا داری



نواب زادہ جمیل الدین عالیؔ

نواب زادہ جمیل الدین عالؔی

جمیل الدین عالؔی نواب سرا میر الدین احمد خاں فرخ مرزا والئ لوہارو کے صاحبزادے نواب صاحب کی تیسری بیوی جمیلہ بیگم کے فرزند دل بند ہیں۔

جمیلہ بیگم ننھیالی رشتے سے نواب فرخ مرزا کی قریبی عزیز ہیں ان کے والد سید ناصر ظہیر نبیرہ خواجہ میر درؔد تھے۔ عالی کی ولادت یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔ تعلیم بی۔ اے تک ہے۔ اپنے ذوق کی بدولت فارسی بھی کافی جانتے ہیں۔ انھوں نے شعر کہنے کی ابتدا ہی کی تھی کہ ملک تقسیم ہو گیا اور فسادات کی بدولت ان کو اور دلّی والوں کی طرح ترکِ وطن کرنا پڑا۔ لیکن اپنی ادبی قابلیت سے پاکستان میں بھی عالی نے اپنا خاص مقام بنایا اور اَب و جَد کا نام روشن کیا۔

۱۹۶۲ء سے ۷۲ء تک بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قائم کردہ اردو کالج کو اقامتی اردو یونی ورسٹی بنانے کے لیے معتمد کی حیثیت سے کام کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سکریٹری ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۰ء تک رہے۔ انجمن ترقی اردو کے آنریری سکریٹری ۱۹۶۰ء سے ہیں۔ چھ ادبی کمیٹیاں جو ادبی انعامات تقسیم کرتی ہیں۔ ان کے بانی اور سکریٹری ہیں۔

عالؔی نے نوعمری میں شادی اپنے ہی خاندان میں کی۔ اُن کی بیوی طیبہ بانو بنت صمصام مرزا ابنِ مرزا عزیز الدین احمد خاں ہیں۔ عزیز مرزا نواب علائی کے منجھلے صاحبزادے تھے۔

عالی کو ذوقِ شعر و ادب ورثے میں ملا ہے۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے، اس لیے

زبان و بیان پر ان کو پوری قدرت حاصل ہے۔ دلی میں عالی اپنے رشتے کے دادا سراج الدین احمد خاں سائل سے اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں سائل کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد عالی نے کسی سے مشورۂ سخن نہیں کیا۔ چونکہ فطری طور پر ان کو شعر کہنے کا شعور حاصل ہے۔ اس لیے بہت جلد ترقی کے منازل طے کر لیے۔ ان کا نام پاکستان کے مشہور شاعروں میں شامل ہوگیا۔ یوں تو خاندانِ لوہارو کے ہر فرد کو شعر موزوں کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ عالی کا شمار اس خاندان کے ان شعرا میں ہے جنھوں نے اپنی خاندانی وجاہت کو اپنے فن سے اور بھی بلند کیا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں کوئی جدت تو پیدا نہیں کر سکے۔ لیکن ان کے کلام میں شدت احساس فکر کی گرمی اور اندازِ بیان کی دل کشی کافی ہے۔ خود ان کی ایک غزل کا مطلع ان کی شاعری پر بہترین تبصرہ ہے ؎

میری نوائے محبت نہ پست نہ تیز — بس ایک رچی ہوئی کیفیتِ الم انگیز

انھوں نے جو کچھ کہا ہے سوچ سمجھ کر اور اپنا انفرادی انداز قائم کیا۔ اس دور میں بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو۔ الفاظ کو ٹھیک انداز سے شعر میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ عالی کہتے ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت اچھا ہوتا ہے اور ان کے شعر بیک وقت دل و دماغ دونوں پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ غالب کا اثر خاندانِ لوہارو کے ہر شاعر پر ہے۔ عالی بھی اپنے بزرگوں کی طرح غالب کے مدح خواں ہیں۔ کئی غزلیں انھوں نے غالب کی طرح میں کہی ہیں۔ کبھی کبھی انھوں نے بڑے دل نشیں انداز میں غالب کو مخاطب کیا ہے:

کوئی سنائے تو عالی کا حال غالب کو — کہ اُن کی آگ میں یہ جل رہا ہے بے چارہ

اور یوں بھی کہتے ہیں:

حیف عالی بھی غزل اس کی غزل پر لکھیں — وہ جو غالب بھی تھا اور معتقدِ میر بھی تھا

عالی اپنے معاصرین سے چشمک نہیں رکھتے۔ یہ بڑی خوبی اُن میں ہے بلکہ ہر اچھے شاعر کی تعریف کرتے ہیں۔ میراجی اور فیض کے متعلق انھوں نے کہا ہے:

میراجی کے ماننے والے کم ہیں لیکن ہم بھی ہیں — فیض کی بات بڑی ہے پھر بھی اب ویسا کون آئے گا

اپنا تو خیر ذکر کیا جوش و جگر سنائیں گے — آپ شاید آئیں گے ہم نے رکھی ہے بزمِ عام

میر دردؔ سے تعلق کے متعلق کہا :

تم جو فقیر دوست ہو، تم جو ہو صاحبِ نگاہ   ہم بھی ہیں آلِ میر دردؔ، ہم بھی ہیں صاحبِ مقام

کراچی میں رہتے ہوئے انھیں دہلوی ہونے پر فخر ہے :

جانتے ہیں تمام لوگ گو کوئی مانتا نہیں   سن تو رکھا ہے تم نے بھی عالیؔ دہلوی کا نام

عالیؔ کے اندازِ بیان میں جو شگفتگی اور بانکپن ہے اس میں فارسی ترکیبوں کے علاوہ بہت بڑا دخل اُن کے صحت مند اندازِ فکر کا ہے، غالبؔ کا رنگ ہو یا مومن کا یا اقبال کا، سلاست بیان سے عالیؔ نے اپنی مرزائی کی شان ہر جگہ برقرار رکھی ہے۔

نمونۂ کلام :

یوں تو نہ رہ سکوں گا میں اے نگہِ غلط خرام   یا کوئی منزلِ سکون یا کوئی راہِ بے مقام
خواہشِ زندگی کے ساتھ کاہشِ زندگی بھی تھی   اب نہ وہ میری آرزو اب نہ وہ میرے اہتمام

بھٹکے ہوئے عالیؔ سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا   کب یہ در و دیوار سجیں گے، کب یہ چمن لہرائے گا

وہ آئے حضرتِ عالیؔ بہ جیب و دامن چاک   بزعمِ خود بڑے باہوش و صاحبِ ادراک

وہی تعلقِ خاطر ہے آج بھی تجھ سے   بہ ایں حوادثِ ایام و گردشِ افلاک
ترے نثار میرے فن کی یوں نہ کر توصیف   میرے یہ نقد و جواہر ترے خس و خاشاک

کہیں تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا   کہ میں بھی ہوں تیری خوشبو کی طرح آوارہ
بغیر مرکزِ امید و بے سکونِ دروں   میں اک خلا ہوں جو ثاقب بنے نہ سیارہ
ہے ایک شہر میں اور مدتوں نہیں ملتا   وہ شخص جس کو رکھا ہم نے جاں سے پیارا

وہ آہِ نیم شبی ہو کہ گریۂ سحری   ہر ایک کاوشِ دل کا مآل بے اثری

سخن میں تمکنت و ضبطِ شوق کے احکام — مگر نظر میں وہی شوخی و خط طلبی
سنا نہیں کبھی غالب کا ذکر اے عالی — یہی ہوا ہے ہمیشہ مآل خوش لقبی

گلہ نہیں جو وہ بیگانہ وار گزرے ہیں — ہم ایسے اہلِ سخن بے شمار گزرے ہیں
ترس نہ کھاؤ میری شدت تباہی پر — کہ عمر بھر یہی لیل و نہار گزرے ہیں
اس انجمن میں تجھے کون پوچھتا عالی — ہزار تجھ سے غریب الدیار گزرے ہیں

کی جو تاخیر تو شرمندہ تاخیر بھی تھا — کیا جتاتے کہ اِدھر کوئی عناں گیر بھی تھا
عمر بھر تہمت و وحشت سے نباہی ہم نے — گو ہمیں رنجِ گراں بارِیِ زنجیر بھی تھا
ہائے یہ جبرِ خموشی کہ ہم اِس محفل میں — ایسے نالاں ہیں کہ گویا لبِ تقریر بھی تھا

مل نہ سکتی کوئی تمثیلِ وفا میرے بعد — میں تو خوش ہوں کہ مجھے بھول گیا میرے بعد
خود اسی شہر کے گلیوں کی روش کہتی ہے — بدلی بدلی سی ہے گلیوں میں فضا میرے بعد
اصطلاحات محبت میں صداقت نہ رہی — لفظ و معنی ہوئے رو رو کے جدا میرے بعد

کیوں بجھ گئے وہ آتشِ پنہاں کو کیا ہوا — عالی تمہارے سوزِ دل و جاں کو کیا ہوا
ہے کیوں قبائے زر سے مکلف تمام جسم — اس افتخارِ چاکِ گریباں کو کیا ہوا
کیوں آگیا ہے ضبط و سلیقہ خطاب میں — اِس شدتِ خلوصِ فراواں کو کیا ہوا

ہائے اس شرم و تکلف پہ یہ ارماں مجھ کو — کوئی سمجھے تو سہی سوختہ ساماں مجھ کو
گزری جاتی ہے ہر اک منزلِ آلام و نشاط — لیے جاتا ہے کہاں شوقِ فراواں مجھ کو
کتنے معصوم ہیں یہ ماہ رخانِ دلی — سب سمجھتے ہیں بس اپنا ہی غزل خواں مجھ کو
ہیں سوالات بہت عشق پہ میرے عالی — کون جانے کہ یہ مشکل ہے نہ آساں مجھ کو

جانِ خلوص، روحِ تمنا کہیں جسے — ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں کہ اپنا کہیں جسے
منجملۂ ہزار غمِ عشق و روزگار — وہ غم بھی ہے کہ سعیِ مداوا کہیں جسے
ہر صاحب نگاہ کے حق میں یہ زندگی — اک جبر ہے کہ جبر گوارا کہیں جسے
افسوس حلقہ ہائے خرد میں اسیر ہے — عالی کہ ایک قلبِ سراپا کہیں جسے

اب یہ کیفیتِ دل ہے کہ چھپائے نہ بنے — اور جو وہ پوچھیں کہ کیا ہے تو بتائے نہ بنے
تو نے کیوں ان کو غمِ زیست دیا ہے یارب — جن سے اک رنجِ محبت بھی اٹھائے نہ بنے
یہ بھی اک رسمِ تماشا ہے وہاں اے عالی — دیکھتے رہیئے مگر آنکھ اٹھائے نہ بنے

عالی نے دوہے اور گیت بھی کہے ہیں۔ دوہوں میں مضامین کا تنوع غزلوں سے بھی زیادہ ہے اور انھوں نے ان دوہوں میں اس دور کے بہت سے پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ اس میں اخلاقی درس اور واعظانہ رنگ پیدا نہیں ہونے دیا۔ ان کی حیثیت ان دوہوں میں ایک تماش بین کی ہے جو زندگی کی رنگارنگی سے لطف لیتا ہے اور آگے چل دیتا ہے، وہ جیتے جاگتے احساسات اور ولولہ جو عالی کے دوہوں میں ہے وہ غزلوں میں نہیں ملتا۔ اس اعتبار سے وہ دوہے ہمارے زمانے کی اردو شاعری میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ یوں دوہے کہنے کو اور شعرا نے بھی کہے ہیں لیکن اتنا رچاؤ اور بیساختگی ذرا کم ہی نظر آتی ہے:

دوہے، گیت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے — من کی آگ بجھی نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

ایک تو یہ گھنگھور بدریا پھر برہا کی مار — بوند پڑے ہے بدن پر ایسے جیسے لگے کٹار

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے — جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

جنم مرن کا ساتھ تھا جن کا انھیں بھی ہم سے بیر
واپس لے چل اب تو عالی ہو گئی جگ کی سیر

چھوٹے بڑوں کے سنگم کا سب دیکھ لیا انجام   پاٹ بڑھایا جمنا نے پر ہے گنگا نام

بیتے دنوں کی یاد ہے کیسی ناگن کی پھنکار   پہلا وار ہے زہر بھرا اور دوجا امرت دھار

اپنے ہی من کا رونا کیا ہر من میں لگی ہے آگ   ساجن مل کر جدا نہ ہوں اے سکھی یہ کس کے بھاگ

روپ بھرا میرے سپنوں نے پایا آیا میرا میت   آج کی چاندنی ایسی جس کی کرن کرن سنگیت

میٹھی میٹھی کسک تھی دل میں نہ کوئی دکھ نہ سوگ   دو ہی دن کے بعد مگر یہ پریت تو بن گئی روگ

عالیؔ اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار   ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

حیدرآباد کا شہر تھا بھیا اندر کا دربار   اِک اِک گھر میں سو سو کمرے ہر کمرے میں نار

بمبئی شہر جب پہنچے عالیؔ آنکھیں تھیں حیراں   کتنی چوڑی چوڑی سڑکیں کتنے اونچے مکاں

بمبئی، پونا، حیدرآباد نہ ہوئے ہم کو راس   پیٹ کو بھر کر کیا کیجے جب من ہی رہے اداس

کیا جانے یہ پیٹ کی آگ بھی کیا کیا اور جلائے   عالیؔ جیسے مہا کوی کو بھی بابوجی کہلائے

عالیؔ بھی اِک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام   جیون بھر نردوش رہیں اور جیون بھر بدنام

کوئی کہے یہ پھلواری ہے کوئی کہے ویراں   کوئی کہے یہ بگلا بھگت ہے کوئی کہے گنوان

کوئی کہے مجھے نانک پنتھی کوئی کبیر کا داس — یہ بھی ہے میرا مان بڑھانا ہے کیا میرے پاس

بول ہزاروں روپ بھرے پر دھرم ہے میرا پیت — نہ میری بانی ہے غزل ہے پیارے نہ دوہے گیت

اُردو والے، ہندی والے دونوں ہنسی اڑائیں — ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

من کے اِک علی بابا کے پیچھے لاکھوں چور — ان ہی چوروں میں من یوں گھومے جوں جنگل میں مور

پہنے مولسری کے کنٹھے سونگھیں سُرخ گلاب — پاکستان میں جو ہوں عالیؔ، دلی میں ہیں نواب

گیت

جب سورج ڈوب گیا
جاگ اٹھے رات کے اندھیارے
اور پھیل گئے سناٹوں پر تاروں کی دمک سے سجتے ہوئے
اور چندر کرن رچتے ہوئے
کچھ بوجھ نئے رکھے جگ پر
کچھ بوجھ ہٹائے —— کوئی روئے کوئی مسکائے
ہم سوتے رہے کھوتے رہے
جب سورج ڈوب گیا
عالیؔ کی باتیں مت سنئے دیوانے ہیں
یہ گیت، یہ غزلیں، یہ دوہے افسانے ہیں، دیوانے ہیں
لفظوں کی یہ سندرتا بلائیں،
یہ بھوکے من کی تمنائیں ویرانے ہیں، دیوانے ہیں

ظاہر ہے یہ ان کی باتوں سے
یہ اصل میں پیار کی گھاتوں سے بیگانے ہیں' دیوانے ہیں
یہ بات چمن چمن چمن چمن کی
بیساکھ میں آشا ساون کی سب گانے ہیں' دیوانے ہیں
جو ان کی باتیں مانیں گے
وہ انھیں نہیں پہچانیں گے انجانے ہیں' دیوانے ہیں

مرزا باقر علی خاں کاملؔ

مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کی دو صاحبزادیاں بنیادی بیگم اور چھوٹی امراؤ بیگم، چھوٹی مرزا غالبؔ سے بیاہی گئیں اور بڑی بہن کی شادی نواب غلام حسین خاں سرورؔ سے ہوئی۔

بنیادی بیگم کے یہاں دو صاحبزادے ہوئے۔ بڑے کا نام تھا زین العابدین خاں اور چھوٹے کا حیدر حسن خاں۔

مرزا غالبؔ کے یہاں جب سات بچے ہو کر مر گئے تو انھوں نے بیوی کے بھانجے عارفؔ کو اپنا متبنّیٰ کر لیا، عارفؔ جوان، صالح اور خوش فکر شاعر تھے، مرزا سے ہی اصلاح لیتے تھے اور طرزِ سخن میں مرزا کے پیرو تھے۔ عارفؔ سے جو مرزا کو محبت تھی یہ صرف رشتہ داری کی وجہ نہ تھی بلکہ عارفؔ سے جس قدر مرزا کو موانست تھی اس کا اظہار اُن کے اِس فارسی قطعے سے ہوتا ہے ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام | کہ رخش شمعِ دودمانِ من است
آں کہ در بزم قرب و خلوتِ اُنس | غمگسار و مزاج دانِ من است

عارفؔ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ہم ز کلک تو خوش دلم و خوش دل
کاں نہالِ ثمر فشانِ من است

مگر افسوس عین شباب میں عارف بھی جن کو کبھی مرزا "راحتِ روحِ ناتواں" اور کبھی "شمعِ دودماں" کہتے تھے داغِ مفارقت دے گئے، اپریل ۱۸۵۲ء مطابق جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ بعارضۂ رعاف واسہال ۳۵ سال کی عمر میں عارف کا انتقال ہوگیا اور مرزا نے ان کی جواں مرگی پر وہ درد بھرا نوحہ لکھا جو مرزا کے بہترین کلام میں شمار کیا جاتا ہے۔

بیگم عارف کا انتقال چند مہینے پہلے ہوچکا تھا اس لئے مرزا غالب، عارف کی وفات کے بعد حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے، باقر علی خاں جن کی عمر ۵ سال کی تھی اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے مگر بنیادی بیگم بھی جواں مرگ بیٹے کے غم میں جلد ہی ختم ہوگئیں اور باقر علی خاں بھی مرزا کے آغوشِ محبت میں آگئے۔ خود فرماتے ہیں:

"کما بیش و پنج سال است کہ دو کودک بے مادر و پدر رہم از دودۂ آں زن کہ خون منش بگردن، بفرزندی برداشتہ ام" (دستنبو صفحہ ۲۷)

ان دونوں بچوں سے مرزا کو محبت نہیں عشق تھا، کبھی بھی اُن کو اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے اگرچہ خود بے حد تنک مزاج تھے لیکن باقر علی خاں، حسین علی خاں کی ہر وقت نازبرداری کرتے تھے اور ان کا دل میلا نہ ہونے دیتے تھے۔

کامل و شاداں سے متعلق غالب کے اُن خطوط کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو انھوں نے تفتہ، مجروح، حکیم غلام نجف خاں، اور علاء الدین احمد خاں کو لکھے ہیں۔ اسی طرح غالب کے ان تین خطوں کا مطالعہ مفید ہوگا جو انھوں نے باقر علی خاں کامل کے نام سپردِ قلم کئے ہیں۔ (اردوئے معلّٰی ۳۲۱ تا ۳۲۲)

رام پور کے دونوں سفروں میں باقر علی خاں، حسین علی خاں مرزا غالب کے ساتھ گئے تھے، مرزا نے دونوں لڑکوں سے نواب صاحب کو نذر دلوائی تھی، رام پور کی آب و ہوا مرزا صاحب کو موافق آئی۔ ان کا ارادہ تھا کہ گرمی اور برسات رام پور میں گزاریں مگر دونوں لڑکوں نے دہلی چلنے کے لئے ضد کی، مرزا نے ان کو تنہا بھیجنا نہ چاہا، خود بھی ان کے ہمراہ نواب صاحب سے اجازت لے کر، ۸ مارچ ۱۸۶۰ء کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۲۴ مارچ سنہ رواں کو دہلی پہونچ کر رمضان کا چاند دیکھا۔

نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں مسند آرائے ریاست ہوئے تو مرزا غالب، نواب فردوس مکاں کی تعزیت اور نواب حال کی مسند نشینی کی تہنیت کے لئے ۱۶ اکتوبر کو

دہلی سے روانہ ہوئے تو دونوں لڑکے بھی ساتھ گئے، یہ دونوں غالب کی جان تھے، چونکہ صغیر سن تھے اور لاڈلے، اس لئے مرزا کو تنگ بہت کرتے تھے، اس مرتبہ مرزا صاحب نے ان دونوں لڑکوں کو ۲۷ر دسمبر کو ملازموں کے ہمراہ دہلی روانہ کر دیا، خود ۲۸ر دسمبر کو روانہ ہوئے، راہ میں ان کو ایک سخت حادثہ پیش آیا، دہلی پہونچ کر انھوں نے اس حادثہ کی تفصیل نواب کلب علی خاں بہادر کو لکھی۔

باقر علی خاں کا خاندان

مرزا باقر علی خاں کے دادا غلام حسین خاں مسرور خلف نواب فیض اللہ بیگ خاں ابن نواب قاسم جان بیگ شرف الدولہ سہراب جنگ تھے۔ یہ وہی قاسم جان بیگ ہیں جو شاہ عالم کے زمانے میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں عارف جان بیگ، عالم جان بیگ کے ہمراہ بلخ سے ہندوستان آئے تھے اور پنجاب میں جنھوں نے معین الملک عرف میر منو خلف نواب قمر الدین خاں وزیر کے ساتھ سکھوں پر فتوحات حاصل کی تھیں اور اپنی دلیری سے پنجاب میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ میر منو کے انتقال کے بعد قاسم جان بیگ نے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ دربار کا رُخ کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ شاہ عالم بنگال میں میرن کے مقابلے میں فوجیں لئے پڑے تھے، یہ بھی وہیں پہنچے اور اپنی بہادری سے بادشاہ کو خوش کر کے شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب پایا، ہفت ہزاری منصب ملا، بادشاہ کے ساتھ تینوں بھائی دہلی واپس آئے اور یہیں سکونت اختیار کی، نواب قاسم جان بیگ تو اکثر جنگی مہمات پر رہتے تھے، دونوں بھائی جاگیر و دیہات کا انتظام کرتے تھے، قاسم جان بیگ نے تین لڑکے چھوڑ کر وفات پائی۔ محمد بخش خاں، فیض اللہ بیگ خاں، قدرت اللہ بیگ خاں۔ محمد بخش خاں کاروبار ریاست سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے اس لئے فیض اللہ بیگ خاں کو ریاست کا کام سنبھالنا پڑا، اپنے باپ کا خطاب شرف الدولہ سہراب جنگ دربار شاہی سے پایا، فیض اللہ بیگ خاں کے تین بچے تھے ایک صاحبزادی انجمن النساء بیگم اور دو صاحبزادے غلام حسین خاں اور نقشبند خاں، نواب غلام حسین خاں نے بدردی اختیار کی، اس لئے ریاست ضبط ہوگئی۔

نواب غلام حسین خاں مسرور اور نقشبند خاں کو ایک ہزار ماہوار تا زیست ملتا رہا، نقشبند خاں لاولد تھے، نواب غلام حسین خاں مسرور کے دو لڑکے تھے۔ زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں۔

زین العابدین خاں، عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے، ابھی دو سال کے ہی تھے کہ باپ کا سایہ

سر سے اٹھ گیا ان کو باپ کی ریاست سے ڈھائی سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی، ۲۱ سال کی عمر میں ان کی شادی اپنے چچا نواب احمد بخش خاں کی بڑی صاحب زادی نواب شمس الدین کی حقیقی بہن نواب بیگم صاحبہ سے ہوئی، شادی کے بعد عارف کو چھوڑ کر فیروز پور سے دامادی کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار ملنے لگی۔ نواب بیگم کا انتقال شادی کے دو سال بعد ہو گیا مگر عارف کو فیروز پور سے تنخواہ تازیست ملتی رہی، عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا محمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی لبستی بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ ان کو سسرال سے "نواب دلہن" کا خطاب ملا۔ ان کی وفات دردِ گردہ سے واقع ہوئی، اس اچانک موت سے عارف کو بڑا صدمہ ہوا اور جب وہ خود زندگی سے قطعی مایوس ہو گئے تو "نواب دلہن" دونوں نشانیوں کو میرزا کے سپرد کیا۔

باقر علی خاں کی شادی

باقر علی خاں کی شادی، ۱۱ سال کی عمر میں معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم بنت نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ہوئی، نسبت عارف اپنی زندگی میں کر چکے تھے۔ یہ رشتہ نواب نیرؔ اور عارف کے لئے ارتباط و خلوص کا نتیجہ تھا۔ نیرؔ نے غالبؔ سے جو قول کیا تھا اس کو نباہا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں تو خیر نواب تھے، اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی اپنی ریاست کے مطابق شان و شکوہ سے کر رہے تھے مگر مرزا غالبؔ نے بھی بہت حوصلہ و ارمان کے ساتھ پورے جاہ و حشم سے باقر علی خاں کی شادی کی، معظم زمانی بیگم کی عمر شادی کے وقت ۱۲ سال کی تھی۔ شادی کے بعد باقر علی خاں سسرال میں رہنے لگے، نواب ضیاء الدین احمد خاں داماد کے تمام اخراجات خود برداشت کرتے تھے لیکن انھوں نے کسی طرح مناسب نہ سمجھا کہ اپنا بار خسر کے سر پر ڈالیں۔ شادی کے تین سال بعد بیس سال کی عمر میں ریاست الور میں مہاراجہ شیو دان سنگھ کی سرکار میں ملازمت کر لی۔ مہاراجہ شیو دان سنگھ بہت قدر دان رئیس تھے، پہلے باقر علی خاں کو مصاحبوں میں رکھا پھر جلد ہی فوج میں لے کر کپتان کے عہدے پر ممتاز کر دیا، باقر علی خاں فنونِ سپاہ گری میں اپنے نامور آبا و اجداد کی طرح ماہر تھے اور شیر کا شکار برچھے سے خوب کھیلتے تھے۔ نواب شہاب الدین خاں ثاقبؔ کے انتقال کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں نے داماد کو الور سے بلالیا

کیونکہ وہ خود جواں مرگ بیٹے کے غم سے دل شکستہ ہوگئے تھے، امورِ ریاست اچھی طرح انجام نہ دے سکتے تھے۔ لائق داماد نے یہ بارا اپنے سر لیا، لیکن افسوس عالمِ شباب میں چاہنے والے خسر کے سامنے ہی ۲۸ سال کی عمر میں، مہینے تپ دق میں مبتلا رہ کر رہ گزائے عالمِ بقا ہوئے مدفن سلطان جی حضرت محبوب الٰہی کی پائینتی میں اپنی خاندانی ہڑوار میں ہے۔ لوحِ مزار پر یہ تاریخ لکھی ہے ؎

چو زین غم خانۂ دنیا سفر کرد　　سوئے باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر کرد　　بود مینو مکاں باقر علی خاں

۱۲۹۳ھ

باقر علی خاں کی اولاد

باقر علی خاں نے تین لڑکیاں چھوڑ کر وفات پائی۔ بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم ۱۲۸۱ ہجری ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئیں، مرزا غالبؔ انھیں بہت پیار کرتے تھے، اور مرزا جیون بیگ کہہ کر پکارتے تھے، سبدچین میں ان کی ولادت کا قطعہ موجود ہے ؎

بہ من ز مقدمِ فرزندِ میرزا باقر　　سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت
"جو قصد" شد متعلق بہ گفتن تاریخ　　طریق تعمیہ در زیدؔ جان غالب گفت

۱۲۸۱ھ

غالبؔ کی وفات کے وقت ان کی عمر چار سال کی تھی، ان کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں باقر علی خاں کی وفات کے بعد اپنے بڑے ماموں شہاب الدین خاں ثاقبؔ کے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ کے ساتھ ہوئی۔ بفضلہٖ تعالیٰ موصوفہ حیات ہیں، ان کے کوئی اولاد نہیں۔

منجھلی صاحبزادی فاطمہ سلطان بیگم (عرف بندو بیگم) صاحبہ کی شادی نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ کے چوتھے صاحبزادے، نواب زادہ بشیر الدین احمد خاں سے ہوئی۔ فاطمہ سلطان بیگم کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہوئیں، چھوٹی صاحبزادی فخر سلطان بیگم کی شادی نواب امیر الدین اعظم مرزا ولیعہد لوہارو، خلف نواب سر امیر الدین احمد خاں سے ہوئی تھی، فخر

سلطان بیگم نے ۲۴ سال کی عمر میں ۶ خورد سال بچے چھوڑ کر انتقال کیا، فخر سلطان کے بڑے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خاں شہریار اب والیٔ لوہارو ہیں۔

فاطمہ سلطان بیگم نے ۵۶ سال کی عمر میں بعارضہ فالج انتقال کیا، ان کے انتقال کے ایک سال بعد ان کے بڑے صاحبزادے معز الدین سام مرزا کا بھی انتقال ہو گیا۔ چھوٹے صاحبزادے ناصر الدین خسرو مرزا اور بڑی صاحبزادی عالیہ سلطان بیگم لیڈی عبدالصمد خاں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں، باقر علی خاں کی چھوٹی صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم (عرف چھمن بیگم) جو ان کی وفات کے وقت ۶ مہینے کی تھیں، بفضلہ تعالیٰ حیات ہیں، ان کی شادی لفٹننٹ کرنل ذوالنور علی احمد سے ہوئی تھی، ان کے ۵ صاحبزادے اور ۵ صاحبزادیاں ہیں۔

نانی اماں (معظم زمانی بیگم) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ بندر مرزا صاحب کے پاس بیٹھا آم کھاتا رہا اور وہ ضعف بصارت کے باعث یہ سمجھتے رہے کہ یہ جندو بیگم ہیں۔ داروغہ کلو آئے تو انھوں نے بندر کو دھتکارا۔

نانی اماں نے فرمایا کہ عالم سکرات مرزا صاحب پر کئی گھنٹے طاری رہا، حکیم محمود خاں نے کہا ان کی جان کسی چیز میں اٹکی ہوئی ہے، سب لوگوں نے غور کیا تو پتا چلا کہ جندو بیگم میں مرزا صاحب کی جان اٹکی ہوئی ہے۔ حکیم محمود خاں نے ہدایت کی کہ جس طرح وہ ہمیشہ آتی ہیں اسی طرح آنے دو، چنانچہ جندو بیگم کو مرزا صاحب کے پاس لے جا کر چھوڑا تو انھوں نے حسب معمول ان کے سینے پر سر رکھ کر منہ کان کے قریب لے جا کر آواز لگائی "دادا جان" اور مرزا نے فوراً آنکھ کھول کر اپنی لاڈلی پوتی کو دیکھا اور جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔

باقر علی خاں کی بیوی

نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی صاحبزادی اور عارف کی بڑی بہو، خاندان کی ایک ایسی فرد تھیں جو بیاہ کر حضرت غالب کے گھر گئیں، جنھوں نے مرزا صاحب کو بہت قریب سے

نوٹ: یہ مضمون ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا تھا۔ محمد سلطان بیگم کا انتقال ۱۰ر مارچ ۱۹۵۴ء میں ہو گیا رقیہ سلطان بیگم بھی ۲۲ر جون ۱۹۵۶ء کو اپنی بڑی بہن سے جا ملیں۔

دیکھا، ان کی بدلہ سنجیاں سنیں اور ان کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھا، علم انساب کا ملکہ مرحومہ موصوفہ کو اپنے والد سے ترکے میں ملا تھا، بے حد بیدار مغز اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ اپنے بزرگوں کی شان اور عہد قدیم کی مروت و اخلاق، غربا پروری کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ آپ کی خدمت میں حضرت غالبؔ کے اکثر شیدائی استفادے کی غرض سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ افسوس کا شانۂ نیّر کی یہ شمع روشن ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء کو ۹۳ سال کی عمر میں اپنی محل سرا "ضیا منزل" میں گل ہوگئی۔ قطب صاحب، اپنے خاندانی مقبرے صندل خانہ مرزا بابر والی کوٹھی میں ان کا مدفن ہے۔

میری اپنی بہت سی معلومات نانی اماں کی بدولت ہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ شادی کے ایک سال بعد جو برسات آئی ______ تو مرزا صاحب شام کو گھر میں کھانا کھانے آئے تو کہنے لگے اے ہے بیوی دیکھو کتنا پیارا موسم ہے، کیسی جنوں انگیز ہوائیں چل رہی ہیں، اس وقت میں تم ہو اور میں ہوں۔ یہ بہو تو دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا بنی بیٹھی ہے۔ بیگم غالبؔ تو مرزا کے اس مذاق پر ان کو صلواتیں سنانے لگیں اور نانی اماں شرم کے مارے کوٹھری میں جا گھسیں۔ مرزا صاحب جب باہر چلے گئے تو نکلیں۔

نانی اماں نے کہا تھا کہ نانا جان (باقر علی خاں) علم نجوم سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔ جو حکم وہ لگاتے تھے بالکل صحیح ہوتا تھا۔ اپنے انتقال کے متعلق دو سال قبل انھوں نے کہہ دیا تھا کہ میں آگ میں جل کر مروں گا۔ چنانچہ بخار کی آگ میں جل کر ان کا کام تمام ہوا۔ باقر علی خاں فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، فارسی میں باقرؔ اور اردو میں کاملؔ تخلص کرتے تھے، قربان علی بیگ سالکؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ شہر آشوب کے علاوہ ان کا اور کلام نہیں ملتا۔

نانی اماں (معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم) فرماتی تھیں کہ جب شہر آشوب پر تمام شعرائے کرام نظمیں لکھ رہے تھے تو مرزا غالبؔ نے حسین علی خاں سے جن کی عمر اس وقت آٹھ یا نو سال کی تھی کہا، کہ شاداں تو نے میرا نام ڈبو دیا۔ غالبؔ کا پوتا اور ایسا کوڑھ مغز، ایک شعر بھی نہیں کہتا بس ہر وقت پتنگ اڑاتا رہتا ہے۔ شاداںؔ نے جواب دیا، دادا جان، آپ فکر نہ کریں۔ ہم ضرور شعر کہیں گے۔ مشاعرہ ہوا، نامی گرامی شعرا نے دلی کی تباہی اور بربادی پر نظمیں لکھی تھیں اور

بڑے سوز و گداز سے سنا رہے تھے، پورا مجمع ساکت تھا۔ اہلِ مشاعرہ پر افسردگی کا عالم طاری تھا، دلّی کی تباہی، دوستوں، عزیزوں کے بچھڑ جانے کا خیال، دل خون کئے دیتا تھا۔ یکایک غالبؔ نے شاداںؔ کی جانب نظر اٹھائی، مجمع کی آنکھیں اُسی نورِ نظر پر لگ گئیں۔ شاداںؔ نے صاف اور پیاری آواز میں پڑھنا شروع کیا ؎

خوب ہوا مٹ گیا جو نام و نشانِ دہلی
میری پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

اس شعر کو سن کر مشاعرے میں اِس سرے سے اُس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی، روتے ہوئے لوگ ہنس پڑے، ہر چہرے پر شگفتگی آگئی اور حضرت غالبؔ نے اپنے ہونہار پوتے کو گلے لگا کر پیار کیا۔

مرزا غالبؔ کی وفات کے بعد حسین علی خاں رام پور کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اُن کی شادی نواب عارف جان کے پوتے حسن علی خاں کی پوتی حسن جہاں بیگم بنت اکبر علی خاں سے مرزا کی وفات کے بعد ہوئی۔ باقر علی خاں کے انتقال کے بعد حسین علی خاں کا توازن دماغی بڑے بھائی کے غم میں بگڑ گیا تھا، لیکن اس حال میں بھی شعر کہتے تھے۔ باقر علی خاں کے انتقال کے ساڑھے تین سال بعد، ڈھائی سال، عارضہ سل میں مبتلا رہ کر ۲۹ سال کی عمر میں حسین علی خاں نے وفات پائی۔ اولاد کوئی نہیں چھوڑی۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے جو تلف ہو گئے۔

مختار الدین آرزوؔ صاحب لکھتے ہیں کہ ایک مختصر سا دیوان کچھ دن ہوئے جناب عرشی کو کتب خانۂ رام پور کے ردّی گھر میں دستیاب ہوا ہے، کچھ منتخب کلام خمخانۂ جاوید میں موجود ہے۔

[۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء]

نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ

معروف کے مورثِ اعلیٰ بلخ سے ہندوستان آئے تھے۔ اِس زمانے میں پنجاب میں معین الملک عرف میر منو خلف نواب قمرالدین خاں وزیر محمد شاہ حاکم تھے۔ معروف کے جدِ امجد عارف جان بیگ اپنے بڑے بھائی قاسم جان اور چھوٹے بھائی عالم جان کے ساتھ لاہور پہنچے اور خاکِ پنجاب میں ہمت کے گھوڑے دوڑا کر ان تینوں بھائیوں نے ناموری حاصل کی۔ میر منو کی وفات کے بعد انھوں نے دلّی دربار کا رخ کیا۔ اِس وقت شاہ عالم میرن کے مقابلے میں فوج لیے بنگال میں پڑے تھے۔ یہ بھی وہیں پہنچے اور اپنی بے مثل شجاعت اور دلیری کے باعث بڑے بھائی قاسم جان نے نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب پایا۔ شاہ عالم کے ہمراہ تینوں بھائی دلّی آئے اور بلیماران کے محلے میں سکونت اختیار کی۔ قاسم جان کی گلی انھی قاسم جان سے منسوب ہے، نواب قاسم جان کی بنوائی ہوئی مسجد اب بھی ہے اور ان کے خاندان کے بچے کچھے افراد اب بھی اس گلی میں رہتے ہیں۔

نواب قاسم جان تو اکثر مہمات پر رہتے تھے۔ منجھلے بھائی عارف جان دیہات اور جاگیر کا انتظام کرتے تھے۔ عارف جان کے چار لڑکے تھے۔ محمد بخش خاں نے لارڈ لیک کی بہت مدد کی اور اپنی کارگزاریوں کی وجہ سے جھرکا فیروز پور کی ریاست پائی۔ مغل دربار سے ان کو نواب فخرالدولہ دلاورالملک کا خطاب ملا۔ پرگنہ لوہارو ریاست الور نے دیا۔ احمد بخش خاں تو والیِ مُلک بنے اور اپنی دلیری اور شجاعت سے انھوں نے بڑا اعزاز اور منصب پایا۔ الٰہی بخش خاں معروف نے زہد و عبادت اور شاعری سے اپنے اجداد کا نام

روشن کیا۔ خاندانِ لوہارو کے وہ پہلے شاعر ہیں۔ غالباً اپنے ذہنِ رسا اور جودتِ طبع کی بدولت انھوں نے مرزا غالب کو دیکھ کر سمجھ لیا ہوگا کہ یہ ہونہار شہبازِ سخن ہوگا۔ اس لیے بجائے کسی دولت مند نواب زادے کے یتیم اور کم عمر مرزا نوشہ سے اپنی لاڈلی بیٹی کو بیاہ دیا۔ یہ کہنا تعلی نہیں حقیقت ہے کہ صاحبِ علم و فضل خسر کی معیت نے غالب کے خیال و فکر کو گہرائی اور کردار کو عظمت بخشی۔ معروف کو شعر و ادب سے دلی لگاؤ تھا اور وہ جتنے بلند درجہ زاہد اور عابد تھے اتنے ہی اونچے شاعر بھی۔ معروف کے زہد و تقدس اور علم و فضل کی بدولت ان کے معاصرین ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ نواب معروف نے فنافی الشعر کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ایک اردو دیوان کے علاوہ مثنوی بھی حسن سبز قبا کی مدح میں پانچ سو بیت کی "تسبیح زمرد"[1] اپنی تصنیف چھوڑی۔ اس مثنوی کی ہر بیت میں التزاماً سبزی کا ذکر ہے۔

مولانا آزاد آبِ حیات میں فرماتے ہیں کہ معروف استاد ذوق کے شاگرد تھے لیکن نواب احمد سعید خاں طالب نے دیوانِ معروف کے دیباچے میں اس کی تردید فرماتے ہوئے لکھا ہے "بھلا یہ کب ممکن تھا کہ ایک کہنہ مشق اور فن شعر کے نکات و رموز سے واقف شاعر ایک ناتجربہ کار نومشق نوجوان سے اصلاح لے۔ مولانا آزاد نے جو واقعہ اپنے استاد ذوق سے منسوب کیا ہے اس میں بھی ذوق کے شعر سنانے اور معروف کی تعریف کا ہی تذکرہ ہے، اصلاح دینے کا کہیں ذکر نہیں، ہاں، یہ ممکن ہے کہ شیخ مرحوم نواب معروف کے پاس استفادے کی غرض سے جاتے ہوں۔ معروف کی داد و دہش کے تذکرے سے آبِ حیات کے کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر تھے۔ اس لیے کبھی جرأت،

---

[1] دیوان معروف اور تسبیح زمرد رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ دیوانِ معروف کا قلمی نسخہ جو نواب احمد سعید خاں طالب کے کتب خانے میں تھا اور جس سے استفادہ کرنے کے بعد میں نے یہ مضمون لکھا ہے اس کو جناب قاضی عبدالودود صاحب نے دیکھا ہے اور اس کے متعلق ایک یادداشت تحریر کی جس کی بنا پر ایک مضمون 'معیار' میں اس کے بارے میں لکھا۔

دیوانِ معروف کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد، کتب خانہ ہندو یونی ورسٹی بنارس میں بھی ہے۔ دیوانِ اول معروف مطبع نظامی بدایوں میں چھپا۔ اس پر مفصل تبصرہ 'معیار' پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ کلامِ معروف کا وافر انتخاب مع تسبیح زمرد تذکرہ سرور میں ہے جو دہلی میں چھپا ہے۔

کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزلیں کہتے۔ لیکن آخر میں چونکہ صاحب دل اور صاحب نسبت تھے خواجہ میر درد کی طرز میں کہنے لگے۔ مولانا آزاد آبِ حیات میں فرماتے ہیں۔" استاد ذوق بڑے ادب و احترام سے نواب معروف کا ذکر فرماتے تھے۔ اور کہتے تھے میں نے ان جیسا سخی آج تک نہیں دیکھا۔ معروف کے دروازے سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا۔ جو سوداگر دہلی میں آتا پہلے ان کے یہاں جاتا۔ ایک مرتبہ سوداگر آیا۔ اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ اس کی آبداری اور جوہر دیکھ کر بہت تعریف کی۔ اور استاذ ذوق کی طرف دیکھ کر کہا" اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے"

استاد نے دوسرا مصرع لگایا ؎ سر لگا دیں ابروِ خمدار کی قیمت میں آج
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

اسی غزل کا مقطع ہے: اک غزل میر درد سی معروف لکھ اس طرح میں
ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے

تذکرہ معروف گلشنِ بیخار، گلستانِ سخن میں تحریر ہے کہ معروف نے شاہ نصیر دہلوی سے کلام پر اصلاح لی۔

معروف کی وفات ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔ وفات کے وقت ان کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی۔ معروف اپنے ذاتی قبرستان حضرت محبوبِ الٰہی میں متصل چونسٹھ کھمبہ مدفون ہیں۔ اس قبرستان میں ہی ان کے صاحب زادے علی بخش خاں رنجور، نواب زین العابدین خاں عارف اور عزیز و اقربا دفن ہیں۔ مرزا غالب کو بھی خسر کی پائینتی جگہ ملی تھی۔ ان کے قریب ہی شریک زندگی امراؤ بیگم کی قبر ہے۔ اب ان دونوں قبروں اور مزارِ عارف کو دیوار کھینچ کر غالب سوسائٹی نے اس قبرستان سے الگ کر دیا ہے۔

معروف کے لڑکے علی بخش خاں رنجور کو حکومت برطانیہ سے مدت العمر وظیفہ ملتا رہا۔ غالب کی تصنیف پنج آہنگ پر رنجور نے مقدمہ لکھا ہے۔ شعر بھی کبھی کبھی کہتے تھے۔ غدر کے بعد دہلی چھوڑ کر عرب سرائے میں جو درگاہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے قریب ہے، مرتے دم تک رہے۔ رنجور کی بیوی مرزا غالب کی سگی بھانجی امانی خانم تھیں۔ رنجور کے دو لڑکے تھے، بڑے مرزا غلام فخر الدین خاں دوسرے محمد سعید خاں ــــــ غلام فخر الدین خاں کی شادی غالب کی بھتیجی مرزا یوسف کی لڑکی عزیز النساء سے ہوئی تھی۔

غلام فخر الدین احمد خاں آخری تاجدار تیموریہ بہادر شاہ ظفر کی ذاتی جاگیر علاقہ کوٹ قاسم کے منتظم، ۱۸۵۷ء تک رہے اور ہر طرح کی مشکلات کا مقابلہ کر کے روپیہ بادشاہ کو بھیجتے رہے۔ اسی لیے گورنمنٹ انگریزی کی نظر میں معتوب ہوئے۔ اس کا ذکر غالب نے اردوئے معلّیٰ میں کیا ہے۔

مرزا نصر اللہ خاں مرزا محمد سعید خاں صاحب کے فرزند تھے جو حیدر آباد میں جج کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کی اولاد بھی حیدر آباد میں ہی ہے۔ نصر اللہ خاں صاحب کا انتقال ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔

نمونۂ کلام معروفؔ

بجز الحمد للہ اہلِ دیں کا — کہاں منہ وصف رب العالمیں کا
کرم سے اس کے اپنے پر ہے نازاں — اثر فریاد دل ہائے حزیں کا
فقط اب ہم گنہگاروں کو معروفؔ — بھروسہ ہے شفیع المذنبیں کا

مجھ کو دنیا میں سیہ بخت اگر کرنا تھا — رنگِ خالِ رخِ جانانہ بنایا ہوتا

جب سے محوِ حسن اپنا وہ ستمگر ہو گیا — مجھ میں اُس میں آئینہ سدِ سکندر ہو گیا
کس نے کی ہے بے تکلف آج گلگشتِ چمن — جس کی خوشبو سے دماغِ گل معطر ہو گیا
گر غزل ایسی لکھے اب جس سے خوش ہو اہلِ دل — تو تجھے معروفؔ ہم جانیں سخنور ہو گیا

نہیں تیرے قریب زلف خالِ اور کان کا پتّا — یہ سنبل ہے یہ ریحاں ہے، یہ ہے ریحان کا پتّا
سجے ہے یہ تجھے اے سرو قد جیغہ[1] زمرد کا — نہ اس خوبی کا دیکھا نخل نے اس شان کا پتّا

طاقتِ گفتار ہے اب کس کو اُس کے روبرو — کر نہ تو عرضِ تمنا اے لبِ اظہار چپ
تیری چاہت سے صبا نے بھر دیئے ہیں گلستاں — اس قدر نالہ کرا اے عندلیبِ زار چپ

---

[1] جیغہ کلغی کی طرح سر پر شہزادے اور امراء لگاتے تھے۔

منہ میں گو رکھتا ہے اپنے غنچۂ گل سو زباں
پر ہے تیرے روبرو اے غیرتِ گلزار چپ

عالم تصویر کا سا ہر طرف عالم ہے اب
ایک دو بیٹھے ہیں حیراں ہیں کھڑے دو چار چپ

ہو گیا حد سے زیادہ دلِ ویراں آباد
بس غم و یاس و الم خانۂ احساں آباد

صاحبِ خانہ نہ ہو جس میں وہ گھر سونا ہے
خانۂ تن ہے ترے دم سے اے جاں آباد

کشورِ دل ستمِ زلفِ بتاں سے معروفؔ
یہ ویراں نظر آتا ہے نہ چنداں آباد

یاد کر صبحِ چمن میں نفسِ سردِ میرے
سر پہ خاک اپنے اڑاتی ہے صبا میرے بعد

جو ہے تو فکرِ معیشت میں ہے غلطاں معروفؔ
آشتی کا کہیں چرچا نہ رہا میرے بعد

اگر منظور ہے پینا مئے وحدت کے ساغر کا
لیا کر نام ہر دم حضرتِ ساقیِ کوثر کا

الم کا اس کے اے معروفؔ سر پر میرے سایہ ہے
نہیں ہے ایک ذرہ غم مجھے خورشیدِ محشر کا

نہ خواہش ہے گدائی کی نہ ارمان شاہی کا
الٰہی عشق دے بندے کو محبوبِ الٰہی کا

غلامی خسروِ دہلی کی ہے معروفؔ فخر اپنا
کہ ہم عاشق ہے، ہم معشوق محبوبِ الٰہی کا

جب مٹ گیا نشاں ہی گو نام رہ گیا
پھر ہستیِ خراب سے کیا کام رہ گیا

انجامِ کارواں کا سرانجام رہ گیا
جس کام کو ہم آئے تھے وہ کام رہ گیا

عکس اپنی چشمِ مست کا دیکھا نہ ہو کہیں
ساقی جو دیتے دیتے جام رہ گیا

چاہا جو اس نے آپ نے کیا میں نے کیا کیا
معروفؔ مفت بندے پر الزام رہ گیا

کھلے احوال اب کیوں کر بھلا اُس آفتِ جاں کا
کہ جو جاتا ہے قاصد یاں سے ہو رہتا ہے وہ واں کا

نصیر الدین کے ڈھب کی لکھ غزل معروفؔ پر مضموں
جدا ہے یعنی اندازِ سخن ہر اک سخنداں کا

یا مجھے شبنمِ گریاں ہی بنایا ہوتا — ورنہ یارب گُلِ خنداں ہی بنایا ہوتا
تجھ کو مطلب تھا اگر میری پریشانی سے — سر بسر زلفِ پریشاں ہی بنایا ہوتا

رباعیات

شاہینِ نگہ کا اس کے دل صید ہے اب — ثانی جس کا جہان میں ناپید ہے اب
میں ایک تو قید تھا ہی، دل تو بھی پھنسا — چھٹنا معلوم ؟ قید در قید ہے اب

کیا اے عزیزو! آئے تھے تم عدم سے — اس گلشنِ جہاں کو جائے قضا سمجھ کر
سو اب چلو اُدھر ہے آخر برنگِ شبنم — اپنے آپ روحِ ماتم سرا سمجھ کر

ہم تو مر جاتے کبھو کے زیست کی ہے یہ وجہ — ہم تم آپس میں جواب اے دوست تو باہم نہیں
کیا کریں ناچار ہیں یاں راہ عدم سے بس کہ تنگ — سینکڑوں جاتے ہیں پر دیکھا تو دو باہم نہیں

وہ مہر وش اپنی زلف کھولے — کوٹھے پہ چڑھا ہوا کھڑا ہے
ساقی یہ دن ہے مے کشی کا — کیا ابر گھرا ہوا کھڑا ہے

معلوم ہو گیا ہمیں احوال آپ کا — غافل ہے جو کوئی اسے نکتہ کتاب ہے
اب تک ہمیں جواب جو خط کا نہیں لکھا — در پردہ یہ بھی ایک طرح کا جواب ہے

مخمس بر غزل اسد اللہ خاں المتخلص بہ اسد

شرحِ سوزِ دلِ افکار کہوں یا نہ کہوں — ہے مجھے رخصتِ گفتار کہوں یا نہ کہوں
کچھ تو کہہ اے بتِ عیار کہوں یا نہ کہوں — اپنے احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے ہے دلِ وحشت زدہ کب سے باہر　　تس پہ بھی میں نہیں انداز کے ڈھب سے باہر
حرفِ بیجا نہیں آتا میرے لب سے باہر　　نہیں کرنے کا میں تقریرِ ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں

باب پنجم کے گلستاں کی حکایت سمجھو　　مرثیے کی اسے یا کوئی روایت سمجھو
خیر جو سمجھو تو سمجھو یہ نہایت سمجھو　　شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

دیکھ کر بیکسی عاشق و بے یاری دل　　ہے سویدا بھی سیاہ پوش عزاداری دل
ٹکڑے ہوتا ہے جگر دیکھ کے لاچاری دل　　اپنے دل ہی سے میں احوال گرفتاری دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

کوئی کرتا ہے گلہ بھی جو کسو اپنے کا　　لوگ باور نہیں کرتے ہیں پھر اس کو اصلا
ہے یہ مشکل کہ نہیں اور سے مجھ کو شکوا　　دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اِک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

پہلے تو عاشقِ غم کش کی زباں ہے غماز　　اشک و بے تابی و فریاد فغاں ہے غماز
یعنی ہر پردہ میں اک ڈھب کا بیاں ہے غماز　　میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہے درپسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں

ہے سخن واسدِ دل کی مجھے معروف ورد　　ہوں بزندانِ سخن صورت فضلِ الجد
دل باتیں ہوں بھری جبکہ زیادہ از حد　　اب سے وہ میرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسبِ حال اپنے اشعار کہوں یا نہ کہوں

نواب غلام حسین خاں مسرورؔ

شرف الدولہ سہراب جنگ نواب فیض اللہ بیگ خاں کے فرزند ارجمند تھے، ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی بڑی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوئی۔ مسرورؔ نے لہو ولعب میں تمام زندگی گزاری۔ خاندانی بیوی اور بچوں کا کبھی خیال نہیں کیا۔ ان کی فضول خرچی خاندان لوہارو میں مشہور تھی۔ میں نے اپنی نانی[1] اماں سے سنا تھا کہ اپنے استاد کے لئے کہیں سفر میں کھچڑی پکانے کے لئے کاندھوں سے قیمتی دوشالہ اتار کر جلا دیا تھا۔

بنیادی بیگم صاحبہ سے ان کے دو بچے تھے، زین العابدین خاں عارفؔ اور حیدر حسن[2] خاں۔ دوسری شادی انھوں نے ایک باہر کی عورت سنگی جان سے کی تھی۔ ان سے چار صاحبزادے ہوئے۔ غلام حسن خاں محوؔ سب میں بڑے تھے۔ ایک بیٹی تھیں جن کا نام ننھی بیگم تھا۔ غلام حسین خاں مسرورؔ کو ستار بجانے کا بہت شوق تھا۔ شاعری کی بھی لت تھی۔ غالب

---

[1] معظم زمانی بیگم [2] حیدر حسن خاں کی شادی ماہ رخ سلطان بیگم بنت نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ سے ہوئی۔ ریاست جھجنی نواب قاسم جان کو شرف الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ سلطنت مغلیہ سے عطا ہوئی تھی، فیض اللہ خاں بیگ کی بدروی کے باعث انگریز گورنمنٹ نے ضبط کر لی تھی۔

کے ہم زلف تھے۔ غالب نے ان کی مہر و محبت اور مروت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ مسترور نے ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ ان کو ایک ہزار روپیہ مہینہ پنشن سرکار انگریزی سے تازیست ملتی رہی۔

نمونۂ کلام، لہ

ماہ پر میری سیہ بختی کا گر سایہ پڑے — چادر مہتاب ہو دامن شبِ دیجور کا

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا — اُون کا تو کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

نادان نہیں جو اپنے کو رُسوا کرے کوئی — دل ہی نہ بس میں ہووے تو پھر کیا کرے کوئی

بیٹھے کیا کرتے ہیں صحرا میں لگا یوں ہی سہی — چشمِ خوباں نہ سہی دیدۂ آہو ہی سہی
سخت جانی سے دمِ ذبح میرے ہاتھ نہ کھینچ — کہ تجھے تجربہ قوتِ بازو ہی سہی

لہ ماخوذ از گلستانِ سخن ص ۴۲۴

غلام حسن خاں محوؔ

نواب غلام حسن خاں محوؔ، نواب غلام حسین خاں مسرورؔ کی دوسری بیوی کے بڑے لڑکے تھے۔ مسرور کی پہلی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی بڑی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوئی۔ ان سے ان کے دو صاحبزادے نواب زین العابدین خاں عارف اور غلام حیدر حسن خاں تھے۔ بنیادی بیگم صاحبہ سے نواب غلام حسین خاں کے ازدواجی تعلقات کبھی بھی خوش گوار نہیں رہے۔ بیگم صاحبہ حسین بھی تھیں اور سلیقہ شعار بھی لیکن نواب صاحب کی رنگین طبیعت کو عشوۂ دل برانہ اور حسنِ لبِ بام کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ رات دن رنگ رلیاں مناتے رہے۔ آخر مسماۃ سنجی جان سے عقد ثانی کر لیا۔ ان سے چار لڑکے ہوئے۔ گویا نواب عارف کے سوتیلے بھائی غلام حسین خاں محوؔ تھے۔ عارف کو اپنے بھائیوں سے بھی سگے بھائیوں کی طرح محبت تھی۔ محوؔ پہلے اپنا کلام استاد ذوقؔ کو دکھاتے رہے۔ پھر عارف نے ان کو حضرت غالبؔ کی خدمت میں بڑی محبت سے پیش کیا۔ کبھی کبھی خود بھی اِن کے کلام پر اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عارف محوؔ سے کچھ ناراض بھی رہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں سے بھی عارف کی شکر رنجی ان دنوں تھی۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں حضرت غالبؔ کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا ہے۔ ع

نیّر و محوؔ ہوئے ہیں میرے دشمن

محوؔ شطرنج بہت اچھی کھیلتے تھے اور اس سوسائٹی کے رکن تھے جو جلسہ شطرنج کے نام سے نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے متعلق ایک کتاب "نصرت نامہ گورنمنٹ" لکھی تھی۔ اس کا خلاصہ خواجہ حسن نظامی نے "غدر کا نتیجہ" کے عنوان سے چھاپا ہے۔

نمونۂ کلام [۱]

دل لگانے کا مزا دیکھ لیا آخر کار — ہم نہ کہتے تھے کہ اے محوؔ پشیماں ہوگا

قیدِ ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں — آج دم دے کر اجل کو ہو گئے آزاد ہم

اندازِ جنوں کون سا ہم میں نہیں مجنوں — پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں لبِ بام پہ وہ بھی — اتنا تو ہوا ہے میرے نالوں کے اثر سے

سخت جاں محبت سے تیری اے ستمگر ہو گیا — بت پرستی کرتے کرتے میں بھی پتھر ہو گیا

گل کھانے کو دیتے ہیں مجھے غیر کا چھلاّ — ڈھب میرے جلانے کے وہ کیا کیا نہیں کرتے

نوٹ:۔ [۱] "تلامذۂ غالب" مصنفہ مالک رام سے لیا گیا۔

مرزا امتاز الدین احمد خاں مآئل

مرزا امتاز الدین احمد خاں مآئل نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے چوتھے اور چھوٹے بیٹے تھے۔ مآئل کا سنہ ولادت ۱۸۶۶ء ہے۔ عین عالم جوانی انتیس سال کی عمر میں دسمبر ۱۸۹۶ء میں کثرت شراب خوری سے پھیپھڑے گل جانے کے باعث مآئل کا انتقال ہوگیا۔

اپنی یادگار ایک خردسال لڑکا مرزا ناصر الدین احمد خاں چھوڑا، مآئل کمسنی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باعث بیحد لاڈ پیار میں پلے تھے، اس لیے ان کا مزاج بیحد لاابالی ہوگیا تھا۔ اوائل عمری میں خدا جانے کیسے شراب خانہ خراب کی لت پڑگئی لیکن بیکار وہ بھی نہیں رہے، ان کی شادی داؔغ کی بیبی کی بھانجی اور منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم کے ساتھ ہوئی تھی۔ شادی کے بعد حیدرآباد سے داؔغ کا داماد ہونے کی حیثیت سے ان کو غالباً دو سو روپے ماہانہ منصب ملتا تھا اور سرکار انگریزی میں وہ ڈپٹی

۱۔ لاڈلی بیگم کا نکاح مآئل کی وفات کے ڈیڑھ سال بعد سآئل صاحب سے ہوا۔

۲۔ مآئل کی قلمی بیاض میرے خالہ زاد بھائی فاطمہ سلطان بیگم کے صاحبزادے مرزا ناصر الدین احمد خاں المعروف خسرو مرزا کے پاس تھی، اس بیاض کے کچھ ورق پھٹے ہوئے تھے اور بہت ردی حالت میں تھے۔ اس کو جناب حفیظ الرحمٰن واصف نے صاف کر کے اور اس پر پیش لفظ لکھ کر ترتیب دیا اور بھائی خسرو مرزا صاحب نے اس کو ۱۹۶۴ء میں چھپوا دیا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے تک پہنچے۔ شاعری کا شوق خاندانِ لوہارو کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مائلؔ تفریحاً شعر کہہ لیتے تھے۔ اصلاح انھوں نے اپنے کلام پر پہلے مرزا عبدالغنی رشید سے لی پھر نواب علاؤالدین خاں علائی سے مشورہ کیا۔ ان کی ایک قلمی بیاض ملی ہے، جس میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند غزلیں اور کلام ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

اپنا نالہ جب برنگِ شورِ محشر ہو گیا
اشک وجہِ انفعال آب گوہر ہو گیا

چشم پُرنم، جان پُرغم، اشک خونیں، رنگ زرد
عشق کا سامان کچھ ہم کو میسّر ہو گیا

اشک گر پاتا تو طوفان بن کے پاتا آبرو
پستی ہمّت سے قطرہ بن کے گوہر ہو گیا

چشم گریاں، آہِ سوزاں، دردِ غم، شور و بکا
ہم کو سارا رنج کا سامان میسّر ہو گیا

اس عنایت کا اثر یارب کہیں خفت نہ ہو
ساقیا چھلکے نہ کیوں لبریز ساغر ہو گیا

ایک ہم اور سوزشِ جانسوز آہِ شعلہ بار
ایک پروانہ کہ بس آسودہ جل کر ہو گیا

اور ہوں دنیا میں بس دو چار دن کا میہماں
ضعف سے تارِ نفس اب تارِ بستر ہو گیا

شاعری ہے اس کا حق، سب جانتے ہیں اہلِ بزم
لوگ کہتے ہیں کہ مائلؔ بھی سخنور ہو گیا

وہ شبِ وعدہ اگر زیبِ شبستاں ہوتا
کیا عجب عقدۂ مشکل کوئی آساں ہوتا

دردِ غم کس کہوں دل بھی اگر یاں ہوتا
مرا ہمدم، مرا مونس، مرا جاناں ہوتا

تری تقدیر میں گر یوسفِ کنعاں ہوتا
اے زلیخا ترے ہاتھوں ہی میں داماں ہوتا

درد کیسا تھا، الم کس کا، کہاں کی وحشت
وہ جو آتے تو کوئی اور ہی ساماں ہوتا

بزم میں غیر کو ملتا جو کہیں ساغرِ مے
خود مرا ساغرِ مے دیدۂ گریاں ہوتا

مجھ کو تو تم سے محبت ہے نہ مانو نہ سہی
اِک اشارے میں درِ غیر کا درباں ہوتا

دل بھی اک درد ہے ایسا کہ الٰہی توبہ
اس سے بہتر تھا اگر درد کا ساماں ہوتا

میں نے مانا کہ تمھیں رنج سہی مجھ سے مگر
وہ ستم کرتے مرے حق میں جو شایاں ہوتا

ہم تو دل ہی کے منانے میں مٹے جاتے ہیں
یہ نہ منتا تو کہاں زیست کا ساماں ہوتا

تم تصور میں ہی وحشی کے جو آتے رہتے — اس کو صحرائے جنوں رشکِ گلستاں ہوتا
داد مل جاتی اگر دل کی میرے ماہ لقا — آئینہ دیکھتا اور دیکھ کے حیراں ہوتا
اتنی مَے پی کہ چلے شیخ بہکتے آخر — تھوڑا پیتا تو نہ ظالم ترا نقصاں ہوتا
گر نہ نواب علائی کو دکھاتا وہ غزل — عمر بھر بھی کبھی مائل نہ سخنداں ہوتا

عاشقِ بسمل تمنائی ہے بس اِک وار کا — کیا بگڑ جائے گا اے قاتل تیری تلوار کا
دل بھی ہے اور گُل بھی ہے اور میں بھی ہوں اور غیر بھی — کون ہے بیمار تیری نرگسِ بیمار کا
گردشِ طالع یہی ہے بس کہ تم سا یار ہو — میں نہ شاکی آپ کا نے چرخِ ناہنجار کا
رنگ خوں کیوں آنکھ سے اس کی جدا ہوتا نہیں — ساغرِ گلنار دیدہ بن گیا میخوار کا
بزم میں غیروں کی کیوں بیٹھو جلو گا شمع سال — کیا تماشا دیکھنا ہے دیدۂ خونبار کا
دیر ہو، کعبہ ہو یا ہو طور یا وادی سنو — میں بھی اب طالب ہوا ہوں آپ کے دیدار کا
کفر و دیں کو چھوڑ دے ٹوٹے شبِ فرقت نہ دم — رشتۂ جاں جان لے رشتہ میری زنار کا
دعوتِ رنداں کر و اے شیخ ورنہ جان لو — تار بھی باقی نہ ہو گا خرقہ و دستار کا
یہ تو خلوت ہے خموشی اے دلِ ناداں عبث — وقت اب آیا ہے تجھ پر حال کے اظہار کا
کیا عجب ہے نرگسِ شہلا اگے مرقد پہ گر — ہوں شہیدِ ناز ایسی چشمِ مستِ یار کا
اِک نشانی ہے نہ نکلے گی تمامی عمر تک — دل نگہباں بن گیا ہے ناوکِ دلدار کا
جائیے سو بار اک دن خاک دیکھو گے اسے — دشمنِ جاں ہو گیا ہوں کوچۂ اغیار کا
چپ ہو، پڑھتے ہو کیوں، سنتے رہو، کہتے ہیں کیا — کر چکے اندازہ ہم مائل ترے اشعار کا

تا دمِ آخر نہ چھوڑی ہم نے وضعِ میکشی — خونِ دل سخت جگر مے اور گزک فرقت کی رات
قافیہ بدلو، سناؤ، داد دیں گے اہلِ بزم — اس طرح مائل لکھو گے کب تلک فرقت کی رات

وہ سیاہی تھی کہ ڈرتی تھی دعا جاتے ہوئے　　لب پر آ آ کے ٹھہرتی تھی دعا فرقت کی رات

شاد ہوں حیرتیِ عارضِ زیبا ہو کر　　اُن کی آنکھوں میں سمایا ہوں تماشا ہو کر
خوش ہوں کیا پیشِ صنم ناصیہ فرسا ہو کر　　سجدہ پتھر کو کروں بندہ خدا کا ہو کر
تم جو یاں آئے تو جاں آئی گئی تم جو گئے　　حال بگڑا ہے مرا اور بھی اچھا ہو کر
شوخ و بے مہر و دل آزار ہو ٹھہرو دم لو　　بعد مدت کے یہاں آئے ہو کیا کیا ہو کر
کوچہ گردی میں جوانی کو گزارا مائلؔ　　اب تو اے مردِ خدا بیٹھ کسی کا ہو کر

مگر مانوس کچھ خار و بیاباں ہوتے جاتے ہیں　　کہ دامن سے مرے دستِ گریباں ہوتے جاتے ہیں
شبِ وصل عدو جو بال کاکل کے سنورتے ہیں　　وہ سب میرے لیے خوابِ پریشاں ہوتے جاتے ہیں
اثر نے سوزِ الفت کے بنایا شمع کی صورت　　سراپا ہم بھی اشکِ چشمِ گریاں ہوتے جاتے ہیں
وہ رفتہ رفتہ جب رخسار سے پردہ اٹھاتے ہیں　　زمیں پر ذرّے بھی مہرِ درخشاں ہوتے جاتے ہیں
غضب رسوا کیا مائلؔ صفائے قلب نے ہم کو　　کہ روزِ وصل غیروں پر نمایاں ہوتے جاتے ہیں

جو وصلِ غیر کو وہ وصلِ یار سمجھے ہیں　　تو اپنی عمر کو ہم مستعار سمجھے ہیں
تمھارا مونس و غمخوار و یار سمجھے ہیں　　تو اپنا غیر کو ہم رازدار سمجھے ہیں
تمھارے وعدے کا معلوم حشر تک ایفا　　بس اپنی مرگ کو ہم انتظار سمجھے ہیں
نہ چھیڑ رندوں کو زاہد قدرِ رحمتِ حق　　جو سمجھے ہیں تو یہی خاکسار سمجھے ہیں
عبث ہی چشمِ وفا اہلِ روزگار سے آہ　　غم آفریں ہی جسے غمگسار سمجھے ہیں
جہاں کی پڑتی ہیں آنکھیں مرے جنازے پر　　قتیلِ غمزۂ ابروئے یار سمجھے ہیں
نہار کھاکے جنھیں فکرِ شام ہے اے دل　　وہ زندگی کو بہت پائدار سمجھے ہیں
تمام عمر یہ آوارگی میں اے مائلؔ　　کٹی اور اب بھی نہ انجام کار سمجھے ہیں

چہرے کو اس نے خوب دکھایا نقاب میں
اپنی خبر رہی نہ ہمیں اضطراب میں

اے شیخ اور کیا ہے جہانِ خراب میں
پی کر تو دیکھ کیسی ہے لذت شراب میں

جانے دو نیند کی بھی دعا سے اٹھائیں ہاتھ
ہمرہ رقیب کے کہیں آئے نہ خواب میں

مضمونِ دردِ دل نے مگر کچھ اثر کیا
بھیجا ہے میرے خط کو ہی میرے جواب میں

پیمانِ توبہ ساقی پیماں شکن سے کیا
لے آفتاب دیکھ شبِ ماہتاب میں

جب خود لکھے کہ لاؤ کرو جان و دل نثار
ناصح بتا کہ اس کو لکھوں کیا جواب میں

اے دل پڑے گی ہاتھ سے پینی تجھے شراب
گر زہر بھی ہوا قدحِ پُر شراب میں

مائلؔ وصالِ یار ہے اور فرقتِ صنم
کیا اور فرق بھی ہے ثواب و عذاب میں

کوئی تو بات ہے کہ ہوئے ہم سے تم خفا
آگے سی وہ نگاہ نہیں وہ نظر نہیں

ساقی جو دورِ مے ہے تو اس طرح سب کو دے
بتلا ضیائے شمس اِدھر ہے اُدھر نہیں

خط میں لکھا ہوا ہے وہ مضمون بیخودی
قاصد کو اپنی جان کی بھی کچھ خبر نہیں

صدمۂ ہجر سے ملتی نہیں فرصت ہم کو
نظر آتی نہیں اچھی کوئی صورت ہم کو

واں تغافل سے غرض اور ستم یہ کہ یہاں
ضعف سے نالہ کی بھی اب نہیں طاقت ہم کو

رفتہ رفتہ کرم و مہر بڑھے لطف کے ساتھ
جور و غم سہنے کی ہے ہجر میں عادت ہم کو

بختِ برگشتہ نے پھیرا اُسے آتے آتے
ہے گلہ اِس کا نہ گردوں کی شکایت ہم کو

ہے تصور میں وہی صحن چمن کا نقشہ
ہو گئی کنجِ قفس میں بھی فراغت ہم کو

صاف منہ پھیر کے کہتا ہے وہ مغرور جمال
آئینے میں نظر آتی ہے کدورت ہم کو

اس غزل میں لکھے اس وجہ سے تھوڑے اشعار
مائلؔ اب کے نہ زیادہ ہوئی فرصت ہم کو

تصویر کھینچ سکتے ہیں کیا آفتاب کی
پھر تم کو کیا ضرورت ہے ایسی نقاب کی

ساقی ہو جلد بزم میں اب دورِ آفتاب
ہو آبرو دو چند شبِ ماہتاب کی

وہ کون سا ہے دن کہ نہ تھی آرزوئے مرگ
وہ شب کہاں کہ ہم نے تمنای خواب کی
اپنا سمجھ کے غیر کو لکھتا ہوں رازِ دل
کچھ حد نہیں رہی ہے میرے اضطراب کی
ہے آہِ نارسا تو دعائیں بھی بے اثر
یہ شکل ہے زمانے کے کچھ انقلاب کی
اے بیخودی وہ آئے ہیں وعدے پہ میرے گھر
رخصت کہ ہے امید سوال وجواب کی
اِک وہ کہ جن کو پہنچی تمھاری شمیم زلف
اِک ہم کہ شب گزرتی ہے کس پیچ وتاب ں
مائل اٹھا سکے نہ ستمہای یار حیف
یہ عمر اپنی آپ نے یوہیں خراب کی

مرتے نہیں امید سے اب یاد کروگے
جیتے ہیں کسی ناشاد کا دل شاد کروگے
وہ ظلم وستم ہم نے اٹھائے کہ گرے ہیں
جب ہم اٹھیں گے تو ہمیں یاد کروگے
جب عہدِ خزاں پھر وہ کہاں زمزمہ سنجی
مرغانِ چمن نالہ وفریاد کروگے
تصویر کھنچے گی کہیں اس موی ہیاں کی
مرجاؤگے کیا مانی وبہزاد کروگے
پیتے ہو تو پی لو نہیں مسجد کو سدھارو
معلوم ہے اے شیخ جوار شاد کروگے
مائل تمھیں اور وصل کبھی جاؤ سدھارو
اس عمر کو اپنی یوہیں برباد کروگے

وفا کے لفظ کو جو معنی جفا جانے
دیا ہے دل اسے وہ دردِ دل کو کیا جانے
عدو سے ہمنفسی دل پہ شاق ہے لیکن
ہمارا حال کسی طور دلربا جانے
یہ جذبِ دل نے دیا مژدہ لو وہ آتے ہیں
نہ لب سے پائی تھی میری ابھی جانے
کہاں یہ زہرۂ کہاں یہ جگر، کہاں یہ تن
نہ آپ کے آئے گا سینے سے دل گیا جانے
کیا ہے میل بھی مائل نے کس ستمگر پر
جواں ہے اس پہ جنوں پھر وہ فہم کو کیا جانے

خندہ زن بھی ایک پروانہ جلانے پر عبث
تا سحر اے شمع کیوں نالاں رہی گل گیر سے
لاکھ زیبائی کرو لاکھ اپنے کو بناؤ
خود نظر آجاؤگے آئینے میں تصویر سے
پورا پورا وہ جواب نامہ لکھتے کیا کریں
دستِ نازک تھک گیا تحریر کی تحریر سے

دل گیا اب جان کی بھی خیر مانگو جان لو | کیا تمنائے وفا ایسے بتِ بے پیر سے
ٹھوکریں اغیار کی اور جھڑکیاں دربان کی | کوئے جاناں میں کبھی عاشق رہا توقیر سے
عیب دنیا مجھ میں ہیں موجود مائل کیا کروں | کچھ ازل سے ہے عداوت کاتبِ تقدیر سے

شبِ وصل کی کیوں سحر ہو گئی | الٰہی یہ کس کی نظر ہو گئی
شبِ وصل ہر دم وہ کہتے رہے | ارے دیکھ ظالم سحر ہو گئی
شبِ وصل اعدائے تم شاد تھے | مجھے روتے روتے سحر ہو گئی

مثنوی

پلا آج ساقی وہ مجھ کو شراب | کہ ہو کیف میں جس کے رنج و عذاب
مجھے دے لیکن وہ کیف ہو | فکر جو کہوں وہ سخن سیف ہو
کہ دنیا کو کب ہے ثبات و قرار | فقط دو ہی دم کا سمجھ لو شمار
یہ فانی ہے نادان تو جان لے | نصیحت بزرگوں کی بھی مان لے
یہ دنیا بھی فانی ہے گویا چمن | نظامی کا تو نے سنا ہو سخن
"در آ از درِ باغ و بنگر تمام | ز دیگر درِ باغ بیرونِ خرام"
یہ انسان کی زیست ہے پانچ دن | نہ ہو گر یقیں انگلیوں پر تو گن
انھیں پانچ دن میں ہے رنج و خوشی | انھیں میں تو ہے دوستی دشمنی
انھیں میں فنا اور انھیں میں بیاہ | انھیں میں لگا جو اور انھیں میں نباہ
انھیں میں جنازہ انھیں میں برات | انھیں میں اکیلے انھیں میں ہے ساتھ
انھیں میں ہے خلعت انھیں میں کفن | انھیں میں ہے قبر اور انھیں میں چمن
انھیں میں ہوئیں نالشیں اور ملاپ | انھیں میں ہے بیٹی انھیں میں ہی باپ
انھیں میں ہے یہ عشق خانہ خراب | کہ بدتر نہیں کوئی اس سے عذاب
انھیں میں روزہ انھیں زکات | انھیں میں حیات اور انھیں میں ممات

انھیں میں حج اور انھیں میں نماز — انھیں میں ہے گانا انھیں میں ہے ساز
انھیں میں ہی بھیروں انھیں میں ہی بھاگ — غرض کہ اس طرح سے سارے راگ
انھیں میں ہے تحصیل علم و عمل — انھیں میں ہے تکمیل فعلن فعل
انھیں میں ہی سیٹھی انھیں میں بلی — انھیں میں تسلی اور انھیں میں چھکی
انھیں میں ہے فکرِ معاش و معاد — انھیں میں مریدوں کو کرتے ہیں یاد
مگر چاہیئے کرنا ہر کام کو — لیاقت سے پہنچاوے انجام کو
کہو ان میں انسان کیا کیا کرے — یہ کافی ہے جب تک بھی رویا کرے
رہے پانچ دن گر تو کٹتے رہے — انھیں میں رہے پہلے جتنے رہے
جمعہ تھا جو میں سر دھنے میں گیا — تمھیں سب ہے ظاہر جو کچھ واں ہوا
گیا ایک لڑکا گزر خوبرو — عجب خوبرو سر بسر خوبرو
جبیں نور رو رخسار جو نسترن — جوانی میں گویا نہالِ چمن
قمر دیکھ کر جس کو شرمندہ ہو — نہ ہے کوئی ایسا نہ آئندہ ہو
وہ عارض پہ سبزہ کی اس کے پھبن — کہ ہو چاند کے گرد جیسے کرن
وہ غبغب نہیں چاہ خوبی کہو — وہ چہرہ نہیں ماہِ خوبی کہو
دو زلفیں نہ تھیں بلکہ ولیل تھیں — جو سچ پوچھتے ہو تو وہ فیل تھیں
گرا ناگہاں پشتِ رہوار سے — گئی جاں نکل اس تن زار سے
دو ہمشیرگاں اور ایک اس کی ما — یہ جاتی تھیں اِک واسطے ایک جا
وہ درگاہ تھی اِک ولی کی کہیں — پچی بہرِ اولاد واں جاتی تھیں
کہا اس نے میں بھی چلوں اے بہن — ہوا ساتھ وہ بھی نہالِ چمن
چڑھا اپنے گھوڑے پہ وہ شہریار — گرا بس زمیں پر وہیں ایک بار
یہ کیا خوب ان کو ملی ہے مراد — نہ حاصل ہوا کچھ دیا اور بیاد
نصیبوں میں جس کے نہ اولاد ہو — وہ ناشاد پھر کس طرح شاد ہو
جہاں میں قیامت بڑی ہو پڑی — فلک رو پڑا اور زمیں رو پڑی

میں احوال مادر پدر کیا کہوں — زباں سے اگر میں کہوں تو مروں
فغاں حد سے گزری تو غش آگیا — اگر آہ کی ابرِ غم چھا گیا
بکا حد سے گزری تو بے ہوش تھے — جو روئے تو وہ اشک باجوش تھے
کہاں تک لکھوں حال دردو فغاں — کہ لرزاں ہیں دونوں زمین وزماں
سنو اور اک قصہ تازہ ہوا — نیا اور اِک حشر برپا ہوا
مَری ایک عورت بزرگ وجواں — ہوا اور اِک صدمۂ ناگہاں
وہ رشتے میں بھاوج تھی نواب کی — وہ مختار تھی اپنے ہر باب کی
مگر ضیق میں وہ گرفتار تھی — شب و روز اسی میں وہ بیمار تھی
گئی چار شنبے کو وہ بھی گزر — اسی دن مَرا تھا وہ رشکِ قمر!
مَرے ایک ہفتے میں دو جان سے — بجھے دو دیئے دو شبستاں سے
کہاں تک ہو دردو الم کا بیاں — کہاں تک ہو ظلم وستم کا بیاں
کہاں تک لکھوں جورِ چرخِ کہن — کہ با طور ہے طورِ چرخِ کہن
فلک سے فغاں کی ندا ہو گئی — زمیں سے اماں کی صدا ہو گئی
خزاں سربسر سر دھنے ہو گیا — فغاں سربسر سر دھنے ہو گئی
مریں بلبلیں جب خزاں آگئی — کہ اس طرح مرگِ جواں آگئی
بس اب ختم کر داستاں حزیں — کہ مائل زیادہ تو فرصت نہیں

یہ وہ درد ہے ہو قلم سے رقم؟
قلم گر لکھے ہو سر اس کا قلم

ترا دامن جو دیکھا پردہ پوشِ اہلِ عصیاں ہے — اٹھا کر اپنے فتنہ کو قیامت بھی پشیماں ہے
یہی رنگ زمانہ ہے تو اِک کانٹے پہ کھٹکے گی — ہمارا اور مجنوں کا شمار اکت میں بیاباں ہے
دکھاتا میکدہ اپنا جو رضواں آ نکلتے تم — یہ کیا جنت میں جنت ہے یہ کیا ساماں بہ ساماں ہے

سہارا کچھ تو دے مجنوں ذرا تو دل کے ہاتھوں سے
گرا پڑتا ہے پردہ صاحبِ محمل کے ہاتھوں سے

نگاہِ مستِ ساقی نے بنا رکھا ہے متوالا
گرا پڑتا ہے ساغر حضرتِ مائل کے ہاتھوں سے

اے دلِ زار کیا کروں آہ وہ یار اب کہاں
صبر و قرار لے گیا، صبر و قرار اب کہاں

ڈھونڈوں کہاں شباب کو لاؤں کہاں سے ولولے
آئے بہار شوق سے اپنی بہار اب کہاں

اس کی زباں سے پوچھ لو وضع کو اس کی دیکھ لو
مائلِ دشت گرد کا شہر و دیار اب کہاں

آسماں اس کے آستانے کا
ایک ٹکڑا ہے شامیانے کا

رہ گیا ہے نشان سا دل میں
مرغِ ہمت کے آشیانے کا

اک نمونہ ہے خاک کا پتلا
اس کی قدرت کے کارخانے کا

کیوں نہ سمجھوں اشارۂ ساقی
رازداں ہوں شراب خانے کا

ہے یادِ چشمِ مست کہ میخانہ گھر میں ہے
قامت نظر میں ہے کہ قیامت نظر میں ہے

اے سوزِ دل گداز یہ تیرا طفیل ہے
ڈوبی ہوئی جو آہ ہماری اثر میں ہے

اب آگیا تو باغِ جہاں دیکھتا چلوں
اچھا ہے یا برا ہے مگر رہ گزر میں ہے

مائلؔ اٹھا نہ سجدہ سے روتا نہیں ہوں میں
بحرِ کرم کا جوش میری چشم تر میں ہے

برق گرنے لگی ہے گلشن پر
اب خدا حافظ آشیانے کا

چل دیا میں علم کو جب دیکھا
رنگ بدلا ہوا زمانے کا

بچ کے دیر و حرم سے چلتا ہوں
شوق ہے کس کے آستانے کا

رخِ تاباں کو تکے نرگسِ شہلا دیکھے
بے نقاب اس کو جو دیکھے بھی تو کیا کیا دیکھے

اے صبا اس سے میرا شوق بیاں کر دینا
خوبرویوں میں جسے اچھے سے اچھا دیکھے

کل ہی تو مائلِ میخوار نے رحلت کی ہے　　آج تربت پہ چڑھے شیشۂ صہبا دیکھے

نہیں ہے اِس کی عادت آپ سے غفلت شعاروں کی　　خدا سنتا ہے اور سنتا ہے ہم سے خاکساروں کی
کبھی اِس باغ میں جانا کبھی اُس باغ میں رہنا　　بہاریں یاد آتی ہیں ہمیں اگلی بہاروں کی
زبانِ خار پر جو ہیں زبانِ تیشہ پر جو ہیں　　وہ ساری سرگزشتیں ہیں ہمیں آفت کے ماروں کی
شبِ غم میں زمین و آسماں کا ہوش کس کو تھا　　بہت سے داغ دل بھی آگئے گنتی میں تاروں کی
جنابِ شیخ کے تقوے کو مائلؔ اس سے کیا نسبت　　میری توبہ نے برسوں کی ہے خدمت بادہ خواروں کی

سحر سے شام تک دردر مری تقدیر پھرتی ہے　　خدا جانے کیا کرتی ہوئی تدبیر پھرتی ہے
بہار آنے کا مژدہ ہو بسے گا اس کا دیوانہ　　تیری تقدیر اب اے خانۂ زنجیر پھرتی ہے
ہزاروں سجدے کرنے سے نہیں پھرتی نہیں پھرتی　　جو پھرتی ہے تو پھر باتوں ہی میں تقدیر پھرتی ہے
خبر لایا ہی یہ مائلؔ سواری پاس آپہنچی　　تری تقدیر اب اے آسمانِ پیر پھرتی ہے

بنا دی جان پر کیا خاک ہم نے دل کو سمجھایا　　جب اس نے رو کے اپنے عقدۂ مشکل کو سمجھایا
انا لیلیٰ ہی جب آیا زبانِ قیس پر آیا　　جنابِ عشق نے ایسا حق و باطل کو سمجھایا
شبِ فرقت کو یوں کاٹا کہ ہمدردوں میں مل بیٹھا　　کسی نے مجھ کو سمجھایا کسی نے دل کو سمجھایا

سید مطلّبی فرید آبادی

سید مطلبی ۱۵ر نومبر ۱۸۹۳ء فرید آباد میں پیدا ہوتے۔ ان کے والد نواب احمد شفیع نیر فرید آباد میں وسیع جائداد نیز دلی میں کئی دو کانوں کے مالک تھے لیکن انھوں نے اپنی کافی جائداد لہو و لعب کی نذر کر دی اور ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ مطلبی کی والدہ رضیہ سلطان بیگم والیٔ لوہارو نواب علاء الدین خاں علائی کی تیسری صاحبزادی تھیں۔ رضیہ بیگم بہت باحوصلہ اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ جوانمرگ شوہر کے بعد انھوں نے اپنے سب بچوں کی تعلیم و تربیت بہت اچھی طرح کی۔ سید مطلبی کا نمبر بھائیوں میں دوسرا تھا۔ ان کے بڑے بھائی سید ہاشمی تھے اور چھوٹے بھائی سید ابو تمیم ہیں۔

سید مطلبی باوجود جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پانے کے فطری طور پر انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ نوعمری سے ہی انھوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ ورنیکلر اسکول سے مڈل کا امتحان دینے کے بعد ان کی والدہ نے لاہور ایک سال پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ وہاں اسلامیہ اسکول شیرانوالہ گیٹ میں وہ داخل ہو گئے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس زمانے میں لاہور سے روزنامہ اخبار 'زمیندار' نکالا تھا۔ اس کی نظم و نثر نے سید مطلبی کے نوخیز ذہن پر بہت اثر ڈالا اور ملک کی آزادی کے لیے کام کرنے کا ولولہ ان کی رگ و پے میں بھر دیا۔ انھوں نے ایک افسانہ "خولہ کی پوتی کا جنازہ" لکھا جو 'زمیندار' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پرجوش شاعری سے ذہنوں کو متاثر کیا۔

۴۳-۱۹۴۲ء میں ملتان جیل میں وہ زیرِ حراست رہے۔ تقریباً پچاس سال تک وہ کمیونسٹ

تحریک سے وابستہ رہے۔ ۱۹۳۰ کے بعد کی ہر ترقی پسند تحریک میں سید مطلبی جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے وہ بانیوں سے تھے۔

وہ ترقی پسند شاعر، نامور صحافی اور ممتاز ادیب تھے۔ مرتے دم تک انھوں نے ادب کا دامن چھوڑا نہ ترقی پسند تحریک کا۔ ۸۵ سال کی عمر میں ۱۹۷۸ء جولائی کے آخری ہفتے میں سید مطلبی کا انتقال لاہور، ماڈل ٹاؤن میں ہوگیا۔ لیکن وہ اپنے عزیز وطن کو بھلا نہیں سکے۔ افسوس ہے ان کا ۱۹۴۷ء میں انھوں نے لکھی تھی جو ۲۵۰ صفحات پر مشتمل تھی افسوس اس کتاب کا مسودہ دوستوں کے دیکھنے میں کہیں گم ہوگیا۔ ورنہ یہ پچھلے پچاس سال کی ادبی اور سیاسی تحریکات کا مجموعہ ہوتی اور بہت کام کی باتیں اس میں ہوتیں۔

کلام جو مل سکا وہ یہ ہے:

رخصتی سلام[1]

تو وہ سراب کہ آنکھوں نے آن کر دیکھا
تو ایک خواب کہ بھولے نہ جان کر دیکھا
بہ شوقِ بیخودی و بیکلی و بیتابی
پرانے دیس تجھے دل میں ٹھان کر دیکھا
جزیرہ مہندیوں کا پہلوسنِ ژولیدہ
تو گنج آموں کا پر آج ننگا بچا کھڑا
فضا میں لیتا ہے انگڑانیاں جوانی کی
مٹے شباب سے رخشندہ ترا مکھڑا
پرانے چند نشاں بھی ہیں غم میں ڈوبے ہوئے
نئی ابھرتی ہوئی صنعتوں سے شرمندہ
فلک مقام عمارات، دل کشا سڑکیں
نئی وہ نسل کہ آنکھوں میں عقل تابندہ

[1] یہ نظم سید مطلبی نے جب فرید آباد آئے تھے واپسی پر قیامِ دہلی کے دوران ۱۰ اگست ۱۹۶۹ء میں لکھی۔

سلام میرے جنم بھوم تجھ کو لاکھ سلام
غم و خوشی کو یہ آج یاں سے جاتا ہوں
بھینچے دبے ہوئے ہونٹوں میں گا رہا ہوں ضرور
و لے بتا نہیں سکتا کہ کیا میں گاتا ہوں
یہاں سے دور نئے جھونپڑے بناتا ہوں
پُر اعتماد قدم ہر قدم اٹھاتا ہوں
مجھے عزیز ہیں اپنے مقاصد عالی
انہی کے جھنڈے اڑاتا ہوں گیت گاتا ہوں

زمیں وطن ہے میرا اور عوام میرے حبیب
انھیں بڑھانے کو ہر راستہ بتاتا ہوں
اسی میں تو ہیں تیرے نونہال سب ہی ہیں
میں سب کا پیار لیے اپنے ساتھ جاتا ہوں
سلام میرے جنم بھوم تجھ کو لاکھ سلام

صحت مند مزدوروں کا گیت

(''کسان رُت'' منظوم ڈرامہ مطبوعہ ۱۹۳۶ء کے آخری منظر کا آخری گانا)

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں
کون وہ محنت کرنے والے
کپڑا لتّا بننے والے
غلہ پیدا کرنے والے

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

سڑکیں، محل، بنانے والے
ساری ملیں چلانے والے
تھوڑا تھوڑا کھانے والے
اور بھوکوں مر جانے والے

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

غوطے دن بھر کھانے والے
اور پھر موتی لانے والے
پھر لا کر پچھتانے والے
مٹھی چنا ہم پانے والے

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

نہریں کاٹ کے لانے والے
سوکھی زمین ہریانے والے
برتن سارے بنانے والے
خود ہاتھوں پر کھانے والے

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

موٹر ریلیں چلانے والے
لانے اور لے جانے والے
بوجھ عالم کا اٹھانے والے
خود دب کر پس جانے والے

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

تھک کر ہم گر جانے والے
اٹھ کر پھر چل جانے والے
لاکھوں روپے کمانے والے
چند ٹکے خود پانے والے

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

رازِ غربت پایا آخر
مل کر سنکھ بجایا آخر
ظلم کو ہم نے ڈھایا آخر
اپنا رنگ جمایا آخر

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

پھل پایا خون پسینے کا
اب زخم بھرا ہے سینے کا
ہاں لطف ہے اب پھر جینے کا
اب کوئی نہیں خون پینے کا

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

دنیا کے ہم روحِ رواں ہیں
تھے بڈھے پر اب نوجواں ہیں
کہتے تھے جو ہم مالکِ جاں ہیں
بتلائے کوئی وہ لوگ کہاں ہیں

ملک کے مالک ہم ہی ہیں
ملک کے خادم ہم ہی ہیں

ستم زدوں کی تنگ و دو سے رات ٹوٹے گی کلی حیات کی ہر قتل گاہ سے پھوٹے گی
زمام آئے گی محنت کشوں کے ہاتھوں میں تب ہی تو ظلمتِ حاضر سے کب جان چھوٹے گی

ہیّا ھیّا

(زیرِ تعمیر محل کی چھت کے لیے مزدور ایک گرڈر (آہنی شہتیر) پر چڑھا رہے ہیں)

گاڈر لینا کیسے بھائی ایسے بھائی ہیّا ہیّا
بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا محل سرا کا ہاں ہاں بھائی
محل سرا کا ہاں ہاں بھائی بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا
اونچا کرلو ہیّا ہیّا بوجھ اٹھالو ہیّا ہیّا
بوجھ اٹھایا ہیّا ہیّا
ہاتھ بچا کے ہاں ہاں بھائی پیر بچا کے ہاں ہاں بھائی
بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا اونچا کرلو ہیّا ہیّا
شیر بہادر ہیّا ہیّا اونچا کرلو محل سرا کو
بوجھ اٹھالو بوجھ اٹھایا کیسے بھائی ہیّا ہیّا
شیر بہادر ہیّا ہیّا آگے سرکے ہیّا ہیّا
شیر بہادر ہیّا ہیّا ہاں ہاں بھائی ہیّا ہیّا
پیٹ پلے گا ہمارا تمہارا محل بنے گا راجہ جی کا
پیٹ پلے گا ہمارا تمہارا باغ بنے گا راجہ جی کا
پھول کھلیں گے ہاں ہاں بھائی جشن اڑیں گے ہاں ہاں بھائی
پیٹ پلے گا ہمارا تمہارا چار مہینے ہمارا تمہارا
ہاں ہاں بھائی ہمارا تمہارا ہمارا تمہارا ہمارا تمہارا
کیسے بھائی ہیّا ہیّا پیٹ پلے گا ہیّا ہیّا

مارچ کا گیت

(مطبوعہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۷۸ء)

آفات و مصائب سے مت ڈر   اور ظلم و ستم کا خوف نہ کر
شیروں کی کلائی ٹوٹ چکی   پھر گیدڑوں سے اب کیا ڈر
مظلوم کی پستی سے ہی شاید   تو یہاں کچھ ترساں ہے
آفاق میں ہلچل دیکھ ذرا   ہے نوعِ بشر سب محوِ سفر
اٹھ باندھ کمر مایوس نہ ہو   مایوس نہ ہو اٹھ باندھ کمر
جلد ہی وہ دن آئے گا   ساتھی جلد ہی وہ دن آئے گا
ہاں جلد ہی وہ دن آئے گا   ساتھی جلد ہی وہ دن آئے گا
پاکستان کے سب دکھیارے   دل بادل بن جائیں گے
مزدور کسانوں کے نعرے   افلاک سے ٹکر کھائیں گے
جاگیر و سرمائے کے محل   یہ خونِ غریباں کے مرقد
کھنڈرات بنیں گے سب یکسر   مظلوم انھیں ٹھکرائیں گے
یوں سرخ سویرا آئے گا   ظلمت کے علم گر جائیں گے
جلد ہی وہ دن آئے گا ساتھی   جلد ہی وہ دن آئے گا
ہاں جلد ہی وہ دن آئے گا ساتھی   جلد ہی وہ دن آئے گا
تب گلیوں کوچوں میں ہم سب   مل مل کے ترانے گائیں گے
کھیتوں، باغوں، فیکٹریوں پر   لال علم لہرائیں گے
علم و ہنر صنعت و فن   قارون کے پنجے سے چھٹ کر
مفلوکوں کی سب جھونپڑیوں میں   کرن کرن پھیلائیں گے
جلد ہی وہ دن آئے گا ساتھی   دل کے کنول کھل جائیں گے

جلد ہی وہ دن آئے گا ساتھی　　جلد ہی وہ دن آئے گا
ہاں جلد ہی وہ دن آئے گا ساتھی　　جلد ہی وہ دن آئے گا

ذرہ ہر تا بدار حرکت سے　　آمدِ نو بہار حرکت سے
چشم بینا کی روشنی کی قسم　　زندگی میں نکھار حرکت سے

مرزا صلاح الدین احمد خاں محشؔر

نواب زادہ صلاح الدین شہ زماں مرزا محشؔر نواب اعزاز الدین اعظم مرزا کے تیسرے صاحبزادے ہیں۔ محشؔر ۷ ارمئی ۱۹۱۳ء میں قلعہ لوہارو میں تولّد ہوئے۔ تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری گیٹ، دہلی میں پہلے پائی پھر ایچی سن کالج لاہور سے ڈپلومہ کیا۔ اختر شیرانی سے کلام پر اصلاح لی۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

اپنے بڑے بھائی نواب امین الدین خاں کو دس سال بعد دیکھ کر خوشی سے بے خود ہو کر محشؔر نے بیساختہ کہا:

کہوں کیا کہ اللہ کیا سامنے ہے ۔۔۔ نظر کا میری مدعا سامنے ہے
برادر ہے آقا ہے خوش بخت محشؔر ۔۔۔ جھکا سر کو قبلہ نما سامنے ہے

زمانہ کہتا ہے رو کر سلام کرتا ہے ۔۔۔ فسردہ و محو سا ہو کر سلام کرتا ہے
خدا بچائے یہ محشؔر وہی ادا تو نہیں ۔۔۔ وطن کو جب کوئی کھو کر سلام کرتا ہے

کیا بلا ہیں وہ فتنہ گر آنکھیں ۔۔۔ لے گئیں دل ہی چھین کر آنکھیں
ذکر سنتے تھے خوب رویوں کا ۔۔۔ کھل گئیں تم کو دیکھ کر آنکھیں

جان کر اپنا طالب دیدار — پھیر لیں مجھ کو دیکھ کر آنکھیں
ہم کو رونا پڑے گا آنکھوں کو — یوں ہی روتی رہیں گر آنکھیں
شانِ حق آ گئی نظر محشر
کھل گئیں اُن کو دیکھ کر آنکھیں

خواہشِ وصلِ یار کون کرے — موت کو ہمکنار کون کرے
ہوش کس کے بجا ہیں مقتل ہیں — تیغ قاتل کو پیار کون کرے
جب گریبان پھاڑنا ٹھہرا — انتظارِ بہار کون کرے
آؤ محشر کسی پہ مر جائیں
موت کا انتظار کون کرے

آج شرمندہ وہ کیوں اپنے تئیں ہوتے ہیں — اُن کے بسمل کہیں رخصت تو نہیں ہوتے ہیں
کیا غضب ہے کہ وہ جب چیں بہ جبیں ہوتے ہیں — میرے اوسان ہی آپے میں نہیں ہوتے ہیں
بے خودی جیسے شناسا سے خدا ہی سمجھے — آپ آتے ہیں تو ہم اور کہیں ہوتے ہیں
بدگماں آپ نہ ہوں اپنے جنوں سے محشر
یہی انداز تو اندازِ یقیں ہوتے ہیں

آج میرا مبتلا دل ناچتا گاتا ہے کیوں — یہ سکوتِ شب میں نغموں کا مزا آتا ہے کیوں
زندگی کا یہ تماشا دیکھ کر حیرت میں ہوں — کوئی کلیوں کو چمن میں گدگدا جاتا ہے کیوں
اے تخیل تو تو آوارہ، میں تو قید ہوں — یہ قفس میں تو بہاروں کی خبر لاتا ہے کیوں
مجھ پہ محشر توڑ بنا موت کا لازم ہوا
زندگی کو ہائے ہائے چین سا آتا ہے کیوں

نہ جانے میری توبہ کی خبر پانے پہ کیا گزری
صراحی کا ہوا کیا حال پیمانے پہ کیا گزری

کسی کو کیا خبر ہے تیرے دیوانے پہ کیا گزری
ترے آنے پہ کیا بیتی ترے جانے پہ کیا گزری

محبت ہو گئی بدنام ہائے باتوں باتوں میں
زباں پر ایک حرفِ مدعا لانے پہ کیا گزری

کلیجہ منہ کو آتا ہے نہ کہہ اے ہم نشیں ہم سے
بتوں کو چھوڑنے کے بعد بُت خانے پہ کیا گزری

ہمارا ذکر کیا ہے پوچھئے یہ اہلِ محفل سے
تمھارے بزم سے اٹھ کر چلے جانے پہ کیا گزری

بھلا ڈالے ہمارے دل کو صدمے راہِ غربت کے
وطن والو نہ پوچھو یاں پہنچ جانے پہ کیا گزری

گلستاں جل رہا تھا گر رہی تھیں بجلیاں محشرؔ!
نہ پوچھو وقتِ رخصت میرے کاشانے پہ کیا گزری

یہ شعر محشرؔ نے لوہارو سے رخصت ہوتے وقت کہے تھے۔

نوابُ ضیاءالدینُ احمد خاں نیّر رخشاں

نیّر رخشاں نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھر کا لوہارو کے خلف اصغر تھے، نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بھتیجے تھے۔ ان کے مکرم والد نواب احمد بخش خاں نے اپنی بے مثل شجاعت کی بدولت فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ کا خطاب پایا۔ اور فیروز پور جھر کا، سانکرس، پونا ہانا، بچھور، نگینہ لارڈ لیک نے ان کو جاگیر میں عطا کیا۔ مہاراجہ بختاور سنگھ والیٔ الور نے لوہارو کا پرگنہ جاگیر میں دیا۔ نواب احمد بخش خاں کے چار بیٹے تھے۔ نواب صاحب کی پہلی بیگم جوان کی بنتِ عم بھی تھیں۔ ان سے چار بچے ہوئے لیکن ایک بھی نہ جیا۔ پھر بیگم صاحبہ بھی فوت ہوگئیں۔ ان کے انتقال کے بعد نواب صاحب نے دو نکاح کیے۔ ایک میواتی خاتون سے دوسرا اپنے خاندان میں۔ میواتی خاتون بہو بیگم صاحبہ سے شمس الدین احمد خاں اور ابراہیم علی خاں تولد ہوئے اور خاندانی بیگم صاحبہ سے امین الدین احمد خاں، ضیاء الدین احمد خاں تولد ہوئے۔ لوہارو کی جاگیر نواب احمد بخش خاں نے خاندانی بیگم کے دونوں لڑکوں کے نام لکھ دی اور نواب شمس الدین احمد خاں کو اپنی زندگی میں ہی ۱۸۲۶ء میں فیروز جھر کا کا حکمراں بنا دیا۔ نگینہ ابراہیم علی خاں کو دیا۔ نواب شمس الدین احمد خاں کو کمشنر دلّی فریزر صاحب کے قتل کرنے کے الزام میں پھانسی ملی۔ فیروز پور جھر کا اور اس کے ساتھ کے علاقے ضبط کر لیے گئے۔ صرف لوہارو باقی رہ گیا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اپنے والد کی وفات کے وقت چھ برس کے تھے۔ ۱۸۲۱ء اکتوبر میں فیروز پور جھر کا میں



نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیّر رخشاں دہلوی

پیدا ہوئے۔ لوہارو کا پرگنہ ان دونوں بھائیوں کی جاگیر میں تھا لیکن والد کے انتقال کے وقت ضیاء الدین احمد خاں نابالغ تھے۔ زیادہ نظم و نسق بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا اور ان کے حصے کی آمدنی خزانے میں جمع ہوتی رہی۔ بالغ ہونے پر نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مطالبہ کیا کہ مجھے بھی ریاست میں برابر کا شریک سمجھا جائے ورنہ اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے حکومت انگریزی نے یہ دونوں تجویزیں نامنظور کیں اور ۱۸۴۰ء میں فیصلہ کیا کہ نواب بڑے بھائی امین الدین احمد خاں رہیں ضیاء الدین احمد خاں کو اٹھارہ ہزار روپے سالانہ وظیفہ ملتا رہے۔ اس پر نواب ضیاء الدین احمد خاں لوہارو سے مستقل دہلی میں آگئے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی۔ علم تفسیر و حدیث حضرت مولانا شاہ عبدالقادر کے شاگرد رشید مولوی کریم اللہ سے، ادب و فقہ جناب مفتی صدر الدین آزردہ سے، فلسفہ و منطق مولانا فضل حق خیرآبادی سے حاصل کیے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عربی و ترکی بھی اچھی جانتے تھے۔ نیر رخشاں کی فارسی قابلیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۸۸۴ء میں مولانا شبلی نے شیخ علی حزیں کی ایک طرح میں غزل کہی۔ ردیف تھی ع حیراں چہ کنم، فراواں چہ کنم۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے حاصل؟ آخر یہ ٹھہری کہ حزیں اور شبلی دونوں کی غزلیں اہل علم و فضل اصحاب کے پاس بھیجی جائیں ان میں نیر رخشاں کا نام بھی شامل تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نجوم اور ہیئت میں بھی بہت اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ پر پورا عبور ان کو حاصل تھا۔ کتب بینی سے ان کو بہت شغف تھا۔ ان کے کتب خانے میں ہر طرح کے علوم کی نادر کتب موجود تھیں۔ افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں نذرِ آشوب ہو گیا اس کے متعلق غالب ایک خط میں لکھتے ہیں "ڈر کر عرض کرتا ہوں کہ بیس ہزار سے کم کی مالیت کا نہ ہو گا" لیکن نواب صاحب علم و ادب کے ایسے عاشق تھے کہ انھوں نے غدر کے بعد پھر کافی اچھی کتابیں اپنے کتب خانے میں فراہم کر لیں۔ جب حکومت ہند کے سکریٹری ایلیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ لکھی جس میں ہندوستان کے فارسی اور عربی مورخوں کی کتابوں کے ترجمے شائع کیے ہیں نواب ضیاء الدین احمد خاں نے انھیں فراہمی کتب اور ترجمے میں بہت مدد دی تھی۔ اس کا اعتراف ایلیٹ صاحب نے کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔

نواب صاحب کا یہ کتب خانہ ان کی وفات کے بعد نواب سعیدالدین احمد خاں طالب نے ندوۃ العلماء کو دے دیا۔

نواب ضیاء الدین احمد کی تعلیم و تربیت میں غالب نے بہت دل چسپی لی اور مرزا کو اپنے اس شاگردِ رشید پر فخر تھا۔ انھوں نے ایک فارسی قصیدہ نیر رخشاں کی مدح میں کہا ہے۔ غالب نے اپنی زندگی میں سند خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفہ اول نیر رخشاں مقرر ہوئے اور خلیفہ دوم نواب علاء الدین علائی ــــ نیر رخشاں کا تمام کلام نظم و نثر، ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گیا تھا بعد میں جو کچھ جمع ہو سکا اسے ان کے چھوٹے صاحبزادے نواب سعیدالدین احمد خاں طالب نے "جلوۂ صحیفۂ زریں نیر رخشاں" کے تاریخی نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع کرایا تھا۔

نیر رخشاں بڑے جواں مرگ بیٹے اور داماد باقر علی خاں کامل کے بعد بہت مضمحل ہو گئے تھے۔ موت سے پہلے صرف دو تین روز بخار رہا۔ تیسرے دن غفلت طاری ہو گئی اور اسی حال میں چوتھے روز ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء ہفتے کے دن دوپہر کے وقت رحلت فرمائی اور مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کی درگاہ میں اپنی خرید کردہ کوٹھی مرزا بابر والی میں دفن ہوئے۔

مولوی رضی الدین احمد خاں دہلوی نے بے مثل مادۂ تاریخ بہم پہنچایا جس پر مولانا حالی نے مصرعے لگائے۔

چوں ضیاء الدین احمد خاں کشید — رفت از دنیا سوئے دارالسلام
گفت ہاتف بارضی سالِ وفات — "روز شنبہ سیز دہ شہر صیام"

۱۳۰۲ھ

پہلی کتبہ لوحِ قبر پر کندہ ہے خود مولانا حالی نے اس موقع پر دو رباعیاں کہی تھیں۔

غالب ہے، نہ شیفتہ، نہ نیر باقی — وحشت ہے نہ سالک ہے، نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

قمری ہے نہ طاؤس، نہ کبکِ طناز — آتے ہی خزاں کے سب گر گئے پرواز
تھی باغ کی یادگار ایک بلبلِ زار — تو اس کی بھی کل سے نہیں آئی آواز

شمس العلما مولانا شبلی نے فارسی میں مرثیہ لکھا تھا جو ان کی کلیات میں موجود ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں کی شادی شرف الدولہ سہراب جنگ قاسم جان کی پوتی اور مرزا قدرت اللہ خاں کی صاحبزادی امتیاز زمانی عرف حاجی بیگم سے ہوئی تھی۔ اولاد میں دو صاحبزادے شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ اور سعید الدین احمد خاں طالبؔ تھے۔ ثاقبؔ زندگی میں انھیں جوان مرگی کا داغ دے گئے۔ طالبؔ کا انتقال ۱۹۲۰ء میں ہوا۔ یہ دونوں اچھے شاعر تھے۔ صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم نواب زین العابدین خاں عارفؔ کے بڑے صاحبزادے باقر علی خاں کاملؔ سے بیاہی گئیں۔ معظم زمانی بیگم کو علم الانساب کا ترکہ اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ مرزا غالبؔ کے متعلق ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ حضرت غالبؔ کے شیدائی محترمہ موصوفہ سے اکثر استفادہ حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ ایوان نیر کی یہ شمع بھی ۱۹۴۵ء میں بجھ گئی۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

نمونۂ کلام:

شاید بہار آئی کہ جو بخیۂ جنوں — پھر آ رہا ہے جامہ و دستار تار تار
رخشاں پہ غصّے قیس کے ملنے سے کیوں ہوئے — ملتے ہی ہیں ہم بتِ عیار، تار تار

فلک گر نہ تھا، بار اٹھانے کے قابل — تو کیا تھے، ہمیں بار اٹھانے کے قابل

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
دل میں مضمر ہیں معنی باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
نقص سے رنج کچھ نہیں رخشاںؔ — حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

کیا پہنچے تو فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو — بیت الصنم ہے شیخ خدا کا یہ گھر نہیں
رخشاںؔ جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک — آنکھوں میں آ گیا کوئی لختِ جگر نہیں

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش
لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجے

نے خبر میری کہ اب غم کی مجھے تاب نہیں
آدمی ہوں نہ فلک گرچہ خور و خواب نہیں

آنکھ سے نکلے نہیں جذب ہوئے دامن میں
بجز اشکوں کے کوئی گوہرِ نایاب نہیں

یاس اے رجعتِ ایامِ گزشتہ سے ہمیں
گردشِ دہر ہے یہ، گردشِ دولاب نہیں

خون کرنے میں عدو نے کہیں واں دھویا ہاتھ
یاں ٹپکتا مری آنکھوں سے جو خونناب نہیں

ایک قطرہ نہ ملے گا تمھیں مت دھو رکھو
زاہدو! بادہ ہے زمزم کا یہ شور آب نہیں

ہیں جب تھک چکے پھر کیا ہیں پروائے جہاں
نکل اے نالہ کہ اس ضبط کی اب تاب نہیں

اے دلِ شاد الگ ہو، میرے سینے میں نہ رہ
تجھ کو معلوم عزا خانے کے آداب نہیں

نیلوفر ہے تیرے خورشیدِ رخِ روشن سے
گریہ میں چشم جو بیٹھے یہ تہِ آب نہیں

اب فارسی کے چند شعر دیکھیے :

مکن ہلاک کہ شادم بہ نارواے خویش
بروئے من بکشا چشم اعتبار مرا

دلش بسوخت چو بر کارہائے بے مزدم
وفا نتیجہ بہ از مزد دردِ کارِ مرا

نمودہ سعی بہ بے برگیِ من و خجلم
بکیسہ نیست چوں مزد روزگار مرا

ز تیرہ روزی و آشفتگی و رنجوری
بسنج خالِ رخ و زلف و چشم یار مرا

جامِ شراب برکف و نوشیں لبے ببر
دیگر ز حق بگو، کہ ترا التماس چیست

نیّر! نقاب گر نفگند از رخش نسیم
وجہ بباد دادنِ ہوش و حواس چیست

شکستہ طرفِ کلاہ و کشودہ بندِ قبا
چہ بے خودانہ بتِ مے گسار می آید

روشِ دہر بیک گونہ نباشد نیّر
نہ چنیں بود کہ ہست و نہ چناں است کہ بود

نوٹ : صفحہ ۲۹۰ سے ۲۹۲ تک دیکھیے تلامذہ غالب مؤلفہ مالک رام صاحب

ہر نفس تازہ سپاسے بزباں می آید — کہ غمے تازہ نوازندۂ جاں می آید
بدروں خستگیم بیشترست از بیروں — کہ فزوں تر دلم از لب بفغاں می آید
اے اجل! مہلت نظارہ کہ اندُہ خواراں — می سرایند کہ می آید و ہاں می آید
باشد آزاد ز ہفتاد و دو ملت نیّرؔ — ہر کہ در سلسلۂ پیرِ مغاں می آید

گوئی کہ فضلِ حق رسد و ناگہاں رسد — خوش طالعی کہ جذبۂ شوقے بجاں رسد
برزعم محتسب سرِ بازار در کشیم — گر ساغرے پیرِ مغاں ارمغاں رسد
نیّرؔ! برآسماں نہ نہم باز پائے ناز — گر ایں سرِ نیاز، بر آں آستاں رسد

اشکے کہ دریادِ تو، از چشم تر افتاد — دیدۂ صاحب نظراں از نظر افتاد
عطار در دیر و شنہ و حلاّج و سرِ دار — در موقفِ تسلیم، چہ خونہا بدر افتاد
گردم سر پالغز تو اے ساقیِ بدمست — مے در قدمم از دگراں بیشتر افتاد

پیشِ در میکدہ سر نجبیدن دہیم — نشۂ اقبال را اوجِ رسیدن دہیم
وعدۂ بفرداست گر مرحلۂ بیش نیست — شوقِ سبک تاز را، گام دویدن دہیم

از نالہائے زار رہتابم کہ دوست را — بے خواب کردہ دوش باو اگریستن
نیّرؔ بہ پردہ دریِ دردِ تو داشت سعی — افشائے راز می کند اما گریستن

باشم بدہر تا کجا شاد — بنیم بخواب، خواب تا کے
حرماں بامیدِ نسیۂ شہد — از نقدِ شراب، ناب تا کے
نشناختہ بوالہوس ز جانباز — بے مصرفیِ عتاب تا کے

سید احمد شفیع نیّر فرید آبادی

والیِ ریاست لوہارو نواب علاء الدین احمد خاں علائی کی صاحبزادی رضیہ سلطان بیگم کی شادی ۱۸۸۹ء میں فرید آباد نواحِ دہلی کے مشہور رئیس سید احمد شفیع نیّر سے ہوئی جو ادیب و شاعر تھے۔ وہ ایک ناول 'کینولا' کے مصنف ہیں۔ کچھ عرصے فرید آباد سے ایک ماہوار رسالہ 'تہذیب' بھی نکالتے رہے۔ انھوں نے گو کوئی دیوان اپنی یادمیں نہیں چھوڑا، لیکن ان کا کلام لکھنؤ اور یوپی کے دوسرے شہروں سے نکلنے والے 'پیام یار' جیسے رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کی فرقہ وارانہ تباہی کی زد میں فرید آباد بھی آگیا جس کے سبب سید احمد شفیع نیّر اور ان کے فرزندوں کا جمع کردہ کتب خانہ ضائع ہوگیا۔ ان کی ایک نوٹ بک کسی طرح لاہور ان کے فرزند سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ آگئی۔ ان کے ذوقِ سخن کا کسی قدر اندازہ ان اشعار سے ہوسکتا ہے جو اس میں موجود ہیں۔ نمونہ درجِ ذیل ہے:

قطعہ تہنیت بنام نواب امیر الدین احمد خاں فرخ میرزا

مبارک باد گویاں ماہ عید روزہ ہا آمد — زگردوں جامِ شیر از بہر فرخ میرزا آمد
امیر الدین بہادر فخرِ دین و دولت و دانش — رخش مہرِ ضیاء آمد کفش بحرِ عطا آمد
قیاسِ طاعت انجم ازیں حامی تواں کردن — کہ نیّر را دل از مہر تو سرگرم ثنا آمد

الجواب از بہرِ ہائیس لوہارو

خوشا وقتے زبہرِ فرخِ مہجور راز نیّر
مبارک بادِ عید الفطر دردل کش نوآمد

زآمد آمدہ نامہ بشرہ گرمی ہنگامہ
چہ گوید حالِ دل خامہ کہ بہرِ او چہا آمد

برادر جاوداں مانی بدیں فصلِ سخندانی
بہ ظلِ لطفِ سبحانی، ز فرخ ایں دعا آمد

بجواب خط جناب مرزا عزیز الدین احمد خاں ناظم لوہارو

اے برادر عزیز والا جاہ
تم پہ رہوے ہمیشہ ظلِ الٰہ

بعد شوقِ وصال واضح ہو
میں جو لکھتا ہوں حال واضح ہو

نامۂ دل نواز حضرت کا
للہ الحمد آج مجھ کو ملا

پیارے پرویز کی علالت سے
سب کی بے چین یاں طبیعت ہے

یا خدا جلد اس کو صحت ہو
تاکہ دل کو ہمارے راحت ہو

حال یاں کا میں تم کو کیا لکھوں؟
قہر ٹوٹے جو مدعا لکھوں

جد امجد ہمارے فخرِ زماں
جھک گئے ہیں اگرچہ مثلِ کماں

پر ارادہ ہے عقدِ ثانی کا
کہتے ہیں رنگ ہے جوانی کا

سہرا

نواب مرزا ضمیر الدین احمد خاں عالی (۱۸۹۱ء)

رشکِ جاں آپ ہیں اور تاراگی جاں سہرا
خلق سہرے پہ فدا چہرے پہ قرباں سہرا

سرِ عالی پہ چڑھا واہ عروجِ طالع
سارے نوشاؤں کے سہروں کا ہے سلطاں سہرا

سرو و شمشاد ہی ہوتے نہیں گلشن میں نہال
گاتی پھرتی ہیں پرستان میں پریاں سہرا

کیوں نہ ہو روشن و عالی درِ مضمون نیّر
سر پہ باندھے گا مرا عالی ذی شاں سہرا

بنام و خسرو میرزا کے ختنوں پر

مرے نوعمر نوشاؤ نہ تم گھبراؤ سہروں سے — سنائیں گے شبِ وصلت مزے کی داستاں سہرے
کہاں ہیں حضرتِ نیرؔ یہاں آئیں ادھر بیٹھیں — کہ گانے آئی ہیں دلّی سے مہر و مہ وشاں سہرے

مرثیہ

(چند بند)

ہاں پیکِ قلم سرعتِ رفتار دکھا دے — ہاں تیغِ زباں جوہرِ گفتار دکھا دے
ہاں شوقِ رواں آج وہ تلوار دکھا دے — بجلی کو چکا چوند جوہرِ بار دکھا دے
شبیرِ دلاور کی شجاعت کا بیاں ہے
ہمّت کا تہوّر کا مصیبت کا بیاں ہے

کہتی تھی سکینہ کہ چچا جان کہاں ہو؟ — بابا مرے مرنے کو چلے آن کے دیکھو
بھیا علی اکبر اٹھو بابا کی خبر لو — امّاں ذرا سجاد برادر کو جگا دو
یہ وقت مدد کا ہے امام دوسرا کی
سنتا نہیں کوئی بھی دُہائی ہے خدا کی

کرتا تھا رفیقوں سے ادھر شمر یہ تقریر — خیمے سے نکل آئے ادھر حضرتِ شبیر
گر دان کے دامن کہا یا مالکِ تقدیر — واں بیٹھ گئی تھام کے دل شاہ کی ہمشیر
تنہائیِ شبیر پہ ہمشیر بھی روئی
تحریر پہ تقدیر کے تقدیر بھی روئی

مطلعِ ثانی

ہاں ناریو ہشیار کہ غازی نظر آیا — ساونتِ اولوالعزم غازی نظر آیا
مکی مدنی شاہِ حجازی نظر آیا — اور کھیلتا رانوں میں وہ تازی نظر آیا
بجلی کی تڑپ وہ وہ چھلاوے کا چلن ہے
چلنے میں گماں ہوتا ہے رم خوردہ ہرن ہے

یہ کہتے تھے حضرت کہ چلے تیر ادھر سے — ترساں ہوئے ظالم نہ وہ اللہ کے ڈر سے
آواز دی ہاتف کہ لے تیغ کمر سے — حضرت چلے شمشیر بہ کف پھر تو ادھر سے
شمشیر یداللہ بڑی شان سے نکلی
آواز بزن حلقۂ سرطان سے نکلی

سَن سَن جو چلی لشکرِ کفار پہ آئی — سر پر کبھی بیٹھی کبھی گردن میں در آئی
گردن سے جو آگے چلی پھر تا کمر آئی — اس چال سے اکثر کو وہ پامال کر آئی
گر کر جو وہ اٹھی تو یہ ساماں نظر آیا
سر گود میں، تن خاک پہ غلطاں نظر آیا

وزدیدہ نظر تھی کہ ہوئی پار جگر سے — تارِ نگہ شوق تھا پوشیدہ نظر سے
پٹکا تھا کمر کا کہ لپٹی تھی کمر سے — سَن سے گئی اور زن سے پلٹ آئی ادھر سے
پھر کر جسے دیکھا وہ تڑپتا نظر آیا
طائر کی طرح خون میں پھڑکتا نظر آیا

کیا کہنا ہے نیرؔ ترے قربان بیاں کے — سب زخم ہرے ہو گئے ناسورِ نہاں کے
تلوار کے فقرے ہیں کہ فقرے ہیں زباں کے — زخمِ دلِ مجروح کے کٹ کٹ کے ٹانکے
مداحی کا دعویٰ تجھے ہر چند نہیں ہے
میدانِ سخن میں تو وہ لے بند نہیں ہے

ساقی نامہ (مشتمل ۹۰ اشعار)

(۲۸ ستمبر ۱۸۹۰ء در لوہارو)

ساقیِ مہوش آج کہاں ہے | مطرب دل کش آج کہاں ہے
ہے کوئی حاضر ہاں ادھر آیئے | دونوں کو جاکر جلد بلایئے
عیش و طرب نے رنگ جمایا | موسمِ گل کس دھوم سے آیا
بزمِ طرب ہر سو ہے مہیا | انجمنِ دل جو ہے مہیا
نغمہ سرا ہیں قمری و بلبل | سرو خراماں خندہ زناں گل
تازہ شگوفے شاخوں میں آئے | غنچوں نے کیا کیا گل ہیں کھلائے
باغوں میں جاری پانی کی نہریں | نہروں میں سو سو رنگ کی لہریں
لہروں میں عکسِ لالہ و گل ہے | گل میں ہے جزو اور جزو میں کل ہے
سبزہ زمرد لعل ہے لالہ | سبز پری کا سرخ دوشالہ
نغمہ سرا مرغانِ خوش الحان | بلبلِ نالاں مست غزل خواں

غزل

صحنِ گلستاں رشکِ بہشت است | از گل و ریحاں رشکِ بہشت است
چوں گلِ عارض تازہ و خرم | ہر گل خنداں رشکِ بہشت است
غیرتِ حور آں نور مجسم | کوچۂ جاناں رشکِ بہشت است
از گلِ داغش حضرتِ تیرؔ | سینہ سوزاں رشکِ بہشت است

رند سبو کش مرتے ہیں ساقی | ہوش نہیں بد مستوں میں باقی
دیکھ تو کیسا ابر تلا ہے | کیسا درِ رحمت آج کھلا ہے
کالی گھٹائیں جھوم کے آئیں | چار طرف میخانہ پے چھائیں

مست ہیں میکش موسم گل ہے　　جوشِ بہار ساغر و مُل ہے
ساقی گل رو پھول کھلا دے　　غنچۂ دل کھلنے کی دوا دے

سازِ مغنی باز نہ آئے　　راگ برابر پھاگ مچائے
لطف نیا ہو نغمۂ نَے میں　　گائے غزل مطرب نئی لَے میں

غزل

بوتل چھلکے ساغر چھلکے　　جام شراب احمر چھلکے
کشتیِ مَے ہو زورقِ طوفاں　　کوزہ بن کے سمندر چھلکے
ڈر ہے پیالہ غمِ دوراں کا　　بے مَے نہ کہیں بھر کر چھلکے

غزل

کون چمن میں جلوہ کناں ہے　　دیدۂ نرگس تک نگراں ہے
موسمِ گل سے جوششِ محمل ہے　　فصلِ خزاں خود وقفِ خزاں ہے
مست جو سجدہ کرتے ہیں در پر　　کعبہ ہے یا ساقی کی دکاں ہے؟
جمع ہیں میکش دیرِ مغاں میں　　پوچھو تو نیّر آج کہاں ہیں

غزل

بہت شمشاد نے چاہا نہ پایا　　تمہارا سا قدِ زیبا نہ پایا
تمہارے حسن کا اپنی وفا کا　　بھلا کس جا؟ کہاں؟ چرچا نہ پایا
صفائی کیا کہوں تیغِ نظر کی　　کہیں پڑتے اسے اوچھا نہ پایا
مرادل آج لیں، بوسہ وہ کل دیں　　یہ سودا اس طرح چکتا نہ پایا
بسانِ بلبلِ نالہ کشِ ہجر　　لبِ گل برگ کا بوسہ نہ پایا

بہت غمگین و حسرت مند دیکھے
مگر نیّر کوئی تم سا نہ پایا

دیگر

مرنا بھی ترے ہجر میں مشکل نظر آیا ‍ ‍ ‍ ‍ دشوار ہی دیکھا اسے آساں نہیں دیکھا
واعظ نے جو فردوس کی اک دھوم مچا دی ‍ ‍ ‍ ‍ کمبخت نے کیا کوچۂ جاناں نہیں دیکھا
دیکھا ہے کن آنکھوں سے مرے زخم جگر کو ‍ ‍ ‍ ‍ کہتے ہو ڈھٹائی سے ہاں ہاں نہیں دیکھا

دیگر

چھپے طرز ستم ان سے نہ دل میں میہماں ہو کر ‍ ‍ ‍ ‍ طبیعت کی طرح آئے رہے دردِ نہاں ہو کر
بگولے سے اٹھے بیٹھے غبارِ نارواں ہو کر ‍ ‍ ‍ ‍ ہمیں آخر رہے پس ماندہ گردِ کارواں ہو کر
تمنائیں گلے مل مل کے روتی ہیں دمِ آخر ‍ ‍ ‍ ‍ نکلتے ہیں مرے ارماں دل کے ہچکیاں ہو کر
مرد اے دستِ وحشت پھر بہار آئی اڑیں پرزے ‍ ‍ ‍ ‍ گریباں نذر ہو جائے جنوں کے دھجیاں ہو کر

نہ کام آئیں فسوں گفتاریاں وقت سخن اس سے
تمھیں چپ کیسی نیرؔ لگ گئی جادو بیاں ہو کر

نوٹ: سید احمد شفیع نیرؔ ۱۸۶۷ء میں بمقام فرید آباد پیدا ہوئے اور یہاں ہی ۳۹ سال کی عمر میں ۱۹۰۶ء میں وفات پائی۔

سیّد ہاشمی فرید آبادی

پیدائش : ۳۰ جنوری ۱۸۹۰ء —— وفات : ۱۹ جنوری ۱۹۶۴ء بمقام لاہور

یہ سید احمد شفیع نیّر کے فرزند اول اور نواب علاء الدین احمد خاں علائی نواب لوہارو کے نواسے جو فرید آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی چند جماعتوں کی تعلیم فرید آباد میں ہی ہوئی۔ بعدازاں عربک اسکول دہلی میں میٹرک تک تعلیم پائی اور اس کے بعد تھوڑے دن تحصیل سونی پت (ضلع دہلی) میں بندوبست آراضی کے دوران امیدوار تحصیلدار کی حیثیت سے کام کیا۔ انگریز حکام کے اس رویے سے جو ان کا ہندوستانیوں کے لیے تھا سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور پیسہ اخبار لاہور میں کچھ مدت تک نائب ایڈیٹر کی خدمات انجام دیں۔ اسی زمانے میں ان کا تعارف (بابائے اردو) مولوی عبدالحق سے ہوا اور ان کے مشورے سے مکرر سلسلہ تعلیم شروع کیا۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں ان کا مولانا حسرت موہانی سے ملنا جلنا رہا اور وہ سامراج دشمن بن گئے۔ یہ بات سرکار پرست عمالِ کالج کو سخت ناپسند تھی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے دوران انھوں نے پرجوش نظمیں لکھیں ان سے وہ طلبائے کالج میں بہت مقبول ہوگئے۔ ان نظموں میں سب سے زیادہ مشہور "چل بلقان چل،، تھی۔ بعدازاں مسجد کان پور کے انہدام کا واقعہ پیش آیا جس سے متاثر ہوکر ہاشمی صاحب نے وہ نظم لکھی جس میں یوپی کے گورنر سر جیمس میسٹن کو سے

اے قہرمانِ عارضی اے عالِ نمرود وش   شیدائی نصرانیت اے مسندِ بطرس نشین

کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ کالج کی فضا میں اس نظم کی گونج نے سرکار پرستوں کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا چنانچہ ہاشمی صاحب کو کالج اور الہ آباد یونی ورسٹی سے خارج کر دیا گیا۔ قریبی زمانے میں وہ بی اے کا امتحان دینے والے تھے۔ اس فیصلے کے سبب وہ امتحان میں شرکت نہ کر سکے۔

شاعرانہ ذوق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی پہلی مثنوی "صاحب بہادر" جس وقت لکھی ہے اس وقت وہ چھٹی جماعت میں تھے۔ اس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

آپ کی دلی میں رہا کرتے تھے　　صاب بہادر کوئی بگڑے ہوئے

اس مثنوی میں "صاب بہادر" کی خیالی محبوبہ نے ان کے عاشقانہ خط کا جو (مندرجہ ذیل) جواب دیا اس سے ہاشمی صاحب کی اس کم عمری میں ذوق سخن اور انگریزی دانی کے معیار کا پتہ لگ جاتا ہے:-

اس میں لکھا "مائی ڈیر ڈارلنگ　،　آئی وِل میٹ ایٹ بینگلو دِس ایوننگ

میٹ می کائنڈلی اِف یو پلیز　،　ایم یور لوِنگ مسز جے فریز"

ان کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ کبھی کسی استاد سے اصلاح لی یا وہ کسی کے شاگرد تھے۔ ہمارے خیال میں چونکہ وہ نیرؔ کے فرزند اور علائیؔ کے نواسے تھے ہو سکتا ہے انھیں اس کی ضرورت ہی نہ ہوئی ہو۔ البتہ اس وقت کے بزرگ شعراء مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ، مرزا سراج الدین احمد خاں سائلؔ اور مولانا حسرتؔ موہانی سے ایک زمانے میں ان کا میل جول کافی رہا ہے اور اردو فارسی کے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ وہ ہمیشہ کرتے رہے۔

علی گڈھ سے وداع ہونے کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے انھیں اچک لیا جو پرانے پایۂ تخت (کلکتہ) سے اپنا اخبار ہفت روزہ "کامریڈ" دلی میں لا رہے تھے۔ اور "ہمدرد" کے نام سے ایک اردو روزنامہ نکالنے کا بندوبست کر چکے تھے۔ مولانا جوہرؔ کی بہت سی خوبیوں کے باوجود ہاشمی صاحب ان کے ساتھ زیادہ اس لیے نہ رہ سکے کہ زمانے میں مولانا پر انگریزیت طاری تھی اور ہاشمی صاحب مولانا حسرتؔ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک نظم مولانا جوہرؔ کے حوالے کی اور ہمدرد سے تعلق ترک کر دیا اس نظم کے اولین دو شعر درج ذیل ہیں:-

تجھے کیوں کر ہنسی اس زاغ پر آئی جو پھرتا تھا　　بہت اترا ہوا شیخی سے پہنے ہنس کی اترن

کہ تو ہندی مسلماں ہے تجھے خود ہی نہیں بھاتا　　نہ اپنے دیس کا کرتا نہ اپنے ملک کی اچکن

یہی زمانہ تھا جب مولوی عبدالحق کو انجمن ترقی اردو کا سکریٹری چنا گیا اور علی گڈھ کے بجائے اس کا صدر دفتر اورنگ آباد دکن میں قائم کیا گیا۔ ہاشمی صاحب نے اس اہم کام میں مولوی عبدالحق کا ہاتھ بٹایا اور انجمن کے لیے تحریری کام کا آغاز پلوٹارک کی مشہور آفاق کتاب "پیرے لل لاٹوز" (PARALLEL LATOS) کا ترجمہ "مشاہیر یونان و رومہ" کے نام سے کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونی ورسٹی (یعنی پہلی اردو جامعہ) بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے "دارالترجمہ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تو ہاشمی صاحب اس میں ملازم ہو گئے۔ تقریباً ۱۹۴۹ء تک حیدرآباد کی تعلیم گاہوں اور عثمانیہ یونی ورسٹی میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں وہ بیشتر ہاشمی صاحب کی تالیف یا ترجمہ کی ہوئی تھیں اور آج کل ان کی تازہ تصنیف تاریخ مسلمانان بھارت و پاکستان یہاں صرف بطور تاریخ ہی نہیں پڑھائی جاتی ہے اسے اردو ادب کے شاہ کار کا مرتبہ بھی حاصل ہے۔

حیدرآباد کی ملازمت کے آخری زمانے میں ان کا دارالترجمہ سے تبادلہ کر دیا گیا اور وہ ڈپٹی ہوم سکریٹری بنا دیے گئے اور کچھ عرصہ بعد ان کی پنشن ہو گئی اور وہ حیدرآباد سے آ گئے لیکن جب انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر دہلی میں منتقل ہوا تو انھوں نے یہاں مولوی عبدالحق کی نیابت میں کام کیا۔ اور پاکستان کے قیام کے بعد بھی وہ کراچی میں رہتے ہوئے اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے لیکن جب رہائش کے لیے مکان میسر آ گیا اور وہ لاہور چلے آئے تو یہ سلسلہ بھی قائم نہ رہا۔

ہاشمی صاحب کا حیدرآباد کی ملازمت کے دوران ہی رخصت لے کر اس لیے انگلستان جانا ہوا تاکہ حضرت امیر خسروؔ کی مشہور مثنوی تغلق نامہ کی تصحیح اور آڈٹ کر کے شائع کیا جائے معلوم ہوا تھا کہ اس کا ایک اور نسخہ انگلستان کی کسی لائبریری میں موجود ہے۔ کئی ماہ کے تجسس کے بعد وہ اپنا منصوبہ پورا کر سکے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اسی قسم کا کام انھوں نے حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویریؒ کی تصنیف "کشف المحجوب" کے لیے کیا اور موجود نسخے کا مقابلہ ایک ایسے نسخے کیا جو سوویت روس میں طبع ہوا ہے اور دوسرے نسخوں کے برعکس نہایت صحیح ہے۔ لاہور کے قیام کے دوران انھوں نے اور کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے لیکن اہم کام اردو دائرۂ سائیکلو پیڈیا کی تکمیل ہے جو انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی معیت میں کیا۔ ہاشمی صاحب کی تالیف و

تصنیف اور ترجمہ شدہ کتابوں نیز منظومات کو اس مکمل پیش کرنا دشوار ہے۔ اس لیے جن کتب کی تفصیل درج کی جارہی ہے اسے نامکمل سمجھا جائے :

نمبر شمار	کتاب	مصنف	پبلشر و زمانۂ طبع	
۱	تاریخ یونان قدیم جلد اول دوم سوم	جی۔بی۔بیوری	انجمن ترقی اردو	۱۹۱۸ء و ۱۹۲۹ء
۲	تاریخ یونان و رومہ	〃	جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۱۹۱۹ء
۳	مشاہیر رومہ و یونان (جلد سوم)	پلوٹارک	انجمن ترقی اردو	۱۹۱۹ء
۴	تاریخ فرشتہ (حواشی)		دارالترجمہ حیدرآباد دکن	۲۳ء ۲۶ء ۱۹۲۸ء
۵	تاریخ ہند		انجمن ترقی اردو	۲۴ء ۴۲ء ۱۹۴۲ء
۶	تاریخ سلطنت رومہ	جی۔بی۔بیوری	جامعہ عثمانیہ	۱۹۲۹ء
۷	یورپ کا عہد جدید (جلد سوم)	سی۔اے۔فائف	〃	۱۹۳۰ء
۸	معاشی حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب	مورلینڈ	〃	۱۹۳۱ء
۹	اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں	جیمز فرگسن	〃	۱۹۳۲ء
۱۰	بلاد فلسطین و شام	حجابی اسٹریج	〃	۱۹۳۲ء
۱۱	جغرافیہ عالم (جلد اول و دوم)	ای مارسڈن	〃	۱۹۳۴ء
۱۲	یورپ کا عصر جدید (جلد سوم)	سی۔اے۔فائف	〃	۱۹۳۶ء
۱۳	〃 〃 〃 (جلد چہارم)	جی۔بی گرچ	〃	۱۹۳۶ء
۱۴	تاریخ ہند برائے میٹرک	سید ہاشمی	〃	۱۹۳۷ء ۱۹۴۱ء
۱۵	تاریخ انگلستان (جلد اول و دوم)	کیرل و نیسم	〃	۱۹۳۷ء ۱۹۴۱ء
۱۶	تاریخ دولت عثمانیہ (جلد اول و دوم) (انگریزی ترجمہ از پکھتال)	ولاڑون لیئر		۱۹۳۸ء ۱۹۳۹ء
۱۷	تاریخ ہند برائے انٹر	سید ہاشمی		۱۹۳۹ء
۱۸	سہ نظم ہاشمی	〃		۱۹۳۹ء

۱۹ ۔ داستانِ ننگ کار (جلد اول)	اسٹیفن	جامعہ عثمانیہ	۱۹۴۰ء
۲۰ ۔ ہندوستان کی حالت	اوون سڈنی	〃	۱۹۴۰ء
۲۱ ۔ مشاہیر روما و یونان (جلد سوم)	پلوٹارک	〃	۱۹۴۵ء
۲۲ ۔ حکایاتِ رومی (جلد اول و دوم) بہ شرکت نظام شاہ	مولانا روم	انجمن ترقی اردو	۱۹۴۵ء
۲۳ ۔ مشاہیر روما و یونان (جلد چہارم)	پلوٹارک	جامعہ عثمانیہ	۱۹۴۶ء
۲۴ ۔ تاریخ پاکستان و بھارت (دو جلد)	سید ہاشمی	انجمن ترقی اردو	۱۹۵۳ء/۱۹۵۴ء
۲۵ ۔ تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو	〃	〃	۱۹۵۳ء
۲۶ ۔ تلخیص اردو (رسالہ اردو پینتیس سالہ انتخاب)	〃	〃	۱۹۵۳ء
۲۷ ۔ تاریخ ملت عرب (معہ حواشی ہاشمی صاحب)	فلپ حتی	〃	۱۹۵۴ء
۲۸ ۔ مآثر لاہور	سید ہاشمی	ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۵۹ء
۲۹ ۔ غازیانِ تہذیب	جوزف کوٹیلر اینڈ ہیم جیفے	اکیڈمی پنجاب ٹرسٹ لاہور	۱۹۵۹ء
۳۰ ۔ تاریخ ہند (وسطانیہ)	سید ہاشمی	اعظم سٹیم پریس حیدر آباد دکن	۱۳۴۴ فصلی
۳۱ ۔ ارمغان (تاریخ طاہری)	〃		
۳۲ ۔ تاریخ دکن	〃	اعظم سٹیم پریس حیدر آباد دکن	
۳۳ ۔ اندرونِ ہند	〃		
۳۴ ۔ بابر	ہیرلڈ لیم		

ان مطبوعات کے لیے ہاشمی صاحب نے دوسرے علمی کام بھی کیے جن میں سے کچھ کا ذکر ما قبل میں ہوا اور کچھ اور بھی ہیں جو فرید آباد میں ان کے علمی خزانے کے لٹ جانے کے سبب نہ اس وقت راقم کے سامنے ہیں اور نہ ذہن میں محفوظ ہیں۔ مذکورہ بالا کتب کے علاوہ ہاشمی صاحب کے مضامین اور نظمیں رسالہ اردو، قومی زبان کراچی، دائرہ معارف اسلامیہ لاہور، اور اردو نامہ کراچی کے علاوہ برعظیم کے دوسرے رسائل نے چھاپی تھیں جن میں سے حسب ذیل کا اردو نامہ کراچی کے حوالے سے ذکر کیا جا سکتا ہے:

مقالات

۱ ـ قدیم یونانی علم وادب	مطبوعہ اردو	جنوری	۱۹۲۱ء
۲ ـ " " "	"	اپریل	۱۹۲۱ء
۳ ـ تجویز اصلاحِ رسم الخط	"	جولائی	۱۹۲۱ء
۴ ـ لارڈ مکالے کی یادداشت مسئلہ تعلیم	"	جنوری	۱۹۲۲ء
۵ ـ کلامِ غالب (اردو) کی شرحیں	"	اپریل	۱۹۲۲ء
۶ ـ غالب کے نئے کلام کا انتخاب	"	جولائی	۱۹۲۳ء
۷ ـ اردو زبان کے متعلق ضروری اعداد	"	اکتوبر	۱۹۲۴ء

۱۹۲ء

۱۹۲۰ء

۱۹۲ء

۱۹۳ء

۱۹۴۴ء

۱۹۴۶ء

۱۹۴۷ء

۱۹۵ء

۱۹۷ء

۱۰ء

ء

منظومات

۱- یاسمین	اردو	جنوری	۱۹۲۲ء
۲- راجستان ہاشمی	"	اپریل	۱۹۲۳ء
۳- میلادالنبی	"	اکتوبر	۱۹۲۳ء
۴- نظم ہاشمی		اپریل	۱۹۲۵ء
۵- حسن مشتہر		جنوری	۱۹۲۶ء
۶- بجنوری مرحوم کی وفات پر	"	اکتوبر	۱۹۲۶ء
۷- نظر قاصد	"	جنوری	۱۹۲۷ء
۸- کالی ناگن	"	اپریل	۱۹۲۷ء
۹- سراغ مہم	"	جنوری	۱۹۲۸ء
۱۰- غزل	"	اکتوبر	۱۹۳۷ء
۱۱- قطعہ تاریخ وفات مسعود جنگ	"	اکتوبر	۱۹۳۷ء
۱۲- تاریخ وفات سر محمد اقبال	"	اکتوبر	۱۹۳۸ء
۱۳- آغاز مہم	"	اکتوبر	۱۹۴۴ء
۱۴- موسم حج کی دو نظمیں	"	اکتوبر	۱۹۴۶ء
۱۵- نوائے پاکستان	قومی زبان کراچی	۱۶ر اگست	۱۹۴۹ء
۱۶- شعر و سخن	"	۱۶ر فروری	۱۹۵۱ء
۱۷- اردو کی ملی نوعیت	"	یکم مئی	۱۹۵۱ء
۱۸- مرحوم حسرت موہانی	"	یکم جون	۱۹۵۱ء
۱۹- قطعہ تاریخ حسرت موہانی	"	یکم جون	۱۹۵۱ء
۲۰- حالت منتظر	"	۱۶ر جولائی	۱۹۵۱ء
۲۱- نغمہ مرگ	"	یکم اگست	۱۹۵۱ء
۲۲- دور خوش آئند	"	۱۶ر اگست	۱۹۵۱ء

۲۳- تضمین	قومی زبان کراچی	یکم ستمبر	۱۹۵۱ء
۲۴- تاریخ اما عبدالرحمٰن صدیقی	"	یکم ستمبر	۱۹۵۲ء
۲۵- کلفٹن	"	۱۶؍اگست	۱۹۵۴ء
۲۶- بابائے اردو کی خدمات جلیلہ کا اعتراف	"	۲۶؍اپریل	۱۹۵۹ء
۲۷- سفینۂ غزل	"	۱۶؍جولائی	۱۹۶۰ء

اخیر میں ہم اس مقدمہ کا ذکر کرنا ضروری خیال کرتے ہیں جو ہاشمی صاحب نے درثمین پر لکھا جو مسز سروجنی نائیڈو کی چیدہ و مشہور انگریزی نظموں کا ترجمہ ہے اور جسے مولوی حسین ناشر تاجر کتب حیدرآباد دکن نے شائع کیا تھا۔ ہاشمی صاحب نے مسز نائیڈو پر ایک نظم کالی ناگن کے عنوان سے تو لکھی ہی تھی جو ۱۹۲۷ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوئی۔ درثمین پر مقدمہ کے علاوہ ہاشمی صاحب نے تشہیر گل کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی جو مسز نائیڈو کے لیے تھی جو درج ذیل ہے

تشہیر گل

وہ دن اے گل نوخاستہ ہیں یاد تجھے　　چمن میں جب کہ ترا کوئی بیقرار نہ تھا
گیاہ و برگ پیاسے تری جھک کے نہ تھے　　طیور کو ترے جلوے سے اضطرار نہ تھا
یہ چھپی ہوتی تھی شگوفے میں رنگ و بو تیری　　ترے جمال کا عالم میں اشتہار نہ تھا
کہا یہ پھول نے شرما کے "نکتہ چیں خاموش　　کہ ہم کو اپنے نہ کھلنے کا اختیار نہ تھا"